دو مرزا

ایک آیات وجدانی کا مصنف
دوسرا اُس کا مفسّر

از

جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم

بی اے، ایل ایل بی، وکیل حیدرآباد دکن

یہ رسالہ بالاقساط الناظر میں جولائی ۱۹۳۵ء سے جون ۱۹۳۶ء تک شایع ہونے کے بعد اب کتابی صورت میں شایع کیا جاتا ہے

باہتمام اسحٰق علی علوی پرنٹر

الناظر پریس واقع بلدہ لکھنؤ میں طبع ہوا

دو میرزا

(ایک آیاتِ وجدانی کا مصنف دوسرا اُسکا مفسّر)

بانگِ قلقل دریں شبِ تار — لبِ معنیِ خفتہ کرد بیدار
دروازۂ صبح بر رُخم باز — کلکم ز شگافت بر تو انداز
(فیضی)

(۱)

گزشتہ نصف صدی میں اُردو نے ارتقا کے جن دشوار گزار منازل سے گزری ہے اُنھوں نے اپنا اثر زبان اور ادب دونوں پر نہایت گہرا چھوڑا ہے۔ تحریر و تقریر، نظم و نثر، سوانح اور تذکرے، افسانے اور داستانیں، غرض تمام اصناف میں نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کل جن اشعار پر محفلیں سر دھنتی تھیں آج وہ سننے کے قابل بھی نہیں سمجھے جاتے، جس نثر پر ہمارے بزرگ جان دیتے تھے ہم اسے بے معنی اور فرسودہ کہکر پھینک دیتے ہیں۔ جو داستانیں "دربارِ جاناں" دلچسپی کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں وہ موجودہ مہذب طبقے میں "قصۂ پارینہ" اور "حرفِ فضول" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ کل غالبؔ کی زبان سے "انتظارِ ساغر کھینچ" کا نغمہ سن کر محافل کے سامعین تیوریاں چڑھا لیتے تھے، آج اقبالؔ کے لبوں سے "سجدے تڑپ رہے ہیں" کا ترانہ سن کر انجمنوں میں غلغلہ برپا ہو جاتا ہے۔ ندے پیشتر جن نقادوں کو سرور کی قافیہ پیمائی گراں گزرتی تھی، غالبِ عظیم کے بعد اسی طبقے کے نقاد "نیاز فتحپوری" کی "غوغائے سکوت" والی اُردو کی داد دیتے ہیں۔ غرضکہ ادب و زبان کے ہر شعبہ میں نظم و نثر کی ہر صنف میں "ادبِ لطیف" کا دور دورہ ہے، حال کا ترانہ سنج بانگِ دہل پکارتا ہے "فطرت برہنہ تیرے نورانی آئینوں میں" اور کوئی زبان نہیں ہلاتا۔ ماضی کے نغمہ سرا کے "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" پر ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی تھی۔ کل آتشؔ کے "حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا" اور داغؔ کے "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" پر ہندوستان کے جن کونوں سے اعتراض کی پے در پے آوازیں آتی تھیں آج وہی چاروں کونے نظم طباطبائی مرحوم کے "پریشاں باندھ کر جوڑا دوپٹہ اوڑھ کر اُٹھا" پر تحسین و آفریں کے نعرے لگاتے ہیں۔ اُردو پر اکرت کی زائیدہ نہیں ہے عربی فارسی

کی پروردہ ہے وہ مشرق کی زبان نہیں ہے مغرب کی "لنگو" ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

کبھی کبھی لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں قدامت پسند ہوں، لیکن میں نے کبھی دنیا کی بڑھتی ہوئی تہذیب اور اس کے ترقی پذیر تمدن کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہا، میری زبان سے کسی وقت بھی یہ نہیں نکلا کہ فرسودہ رسم و رواج، پارینہ ذہنیت و خیالات کے پابند رہو۔ میرے قلم نے کسی حالت میں بھی یہ نہیں لکھا کہ موجودہ تہذیب و تمدن، حال کے انکشافات و ایجادات سے کنارہ کشی کرو۔ میں نے جو کچھ کہا یہی کہ اندھی تقلید نہ کرو، کسی چیز کو اختیار کرو تو سوچ کر، سمجھ کر، دیکھ بھال کے، اس کے خوب و زشت پر غور کر کے، اسکے حسن و قبح کو جانچ کر، اسکے محاسن و معائب پر نظر کر کے۔ جب کبھی لکھا یہی کہ مشرق اپنی انفرادیت کو زائل کیے دے رہا ہے، اپنی خصوصیات کو کھوئے دے رہا ہے، اپنی روایات کو مٹائے دے رہا ہے، کہ ہم دلش صفات کے پردے میں عیوب، چاہے اچھی باتوں کی آڑ میں آنکھ بند سبق ایک لایق تحسین فعل کے دھوکے میں ود قابل ملامت حرکات، اختیار کر رہے ہیں۔ مشرق اچھائیوں کا گھر نہیں ہے لیکن برائیوں کی بستی ہونا بھی لازم نہیں، مغرب محاسن کا مرکز سہی لیکن معائب سے خالی وہ بھی نہیں ہے۔ اسی ذہنیت نے نہ صرف ہند بلکہ مشرق کے تمام ممالک، بحیرۂ قلزم کے اس طرف کے تمام بلاد کو قعر ذلت میں ڈال رکھا ہے۔ معاشرت نامکمل، اخلاق ناپسندیدہ، طرزِ زندگی ناہموار، نیکی سے کوسوں دور، حمیت سے بالکل بیگانہ، مذہب سے یک لخت عاری۔ یہ ہے موجودہ مشرق کی حالت۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

ہندوستان مشرقی ممالک میں اپنی چند خصوصیات کی بنا پر سب سے بدتر ہے۔ کورانہ تقلید کی صلاحیت بغض و حسد کی اہلیت، خوشامد و تملق کی قابلیت، جتنی اس ملک کے باشندوں میں ہے شاید ہی کہیں اور ملے۔ دنیا بھی عجیب و غریب جگہ ہے، اسنے عروج و زوال کے ہزاروں منظر دیکھے ہیں، اس نے بڑی بڑی سلطنتیں بنتے دیکھی ہیں اور عظیم الشان بادشاہتیں بگڑتے، اس نے مسلمانوں کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب اسپین سے ہند تک اور فرانس سے چین تک دنیا اذانوں کی آوازے گونجتی تھی، جب اللہ اکبر کے نعروں سے سمندروں میں تہلکہ پڑ جاتے تھے، جب فوجوں کے قدموں کے شور سے پہاڑوں میں زلزلے آجاتے تھے، جب مسلمان دم بھرتا صداقت کا، حریت کا، ایمان کا، خدا پرستی کا ——— وہی دنیا آج یہ حال دیکھ رہی ہے کہ روس سے لنکا تک، انگلستان سے جاپان تک، ایک چپہ زمین ایسی نہیں

ہے جہاں اسلام کا بول بالا ہو، آج مسلمان نام ہے تمام عیبوں کے مجموعہ کا، تمام برائیوں کے مخزن کا، تمام خرابیوں کے پتلے کا،

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

ایک چیز ہو تو شکایت کی جائے، ایک دکھ ہو تو رویا جائے، ایک زخم ہو تو علاج کیا جائے۔ اپنے اسلاف سے انھیں دشمنی، اپنے بزرگوں کے یہ درپے آزار، اپنے علماء کے یہ منکر، اپنے نثاروں سے انھیں عداوت، اپنے شعراء سے انھیں بغض، بس شہرت اور دولت کی دھن ہے، کون سی شہرت؟ جھوٹے موتیوں کی سی شہرت، جس میں نہ آب نہ تاب، سراب کا سا نام و نشان، جو دھوکا ہی دھوکا ہے۔ کس قسم کی دولت، حباب کی سی دولت، جو پھونک مارتے ہی ہوا ہو جائے، خواب کی سی امارت جو آنکھ کھولنے میں غائب ہو جائے۔ نمود، جو دوسروں کی عزت پر بیجا حملہ کر کے حاصل کی جاتی ہے، نام، جو اوروں کی شخصیت پر اتہام لگا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ نشان جو انصاف، راستبازی، صاف گوئی، ایمان کو بیچ کر خریدا جاتا ہے۔ یہ سودا ہے کہ اسے حاصل کریں جسے جانتے ہیں کہ پا نہیں سکتے

ڈھونڈنے اُسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

یہ جنون ہے کہ ان مسائل کی تحقیق کریں جنھیں سمجھتے ہیں کہ نہیں سمجھ سکتے، یہ خبط ہے کہ اُن لوگوں میں شامل ہوں جن سے جانتے ہیں کہ احتراز کرنا چاہیے۔ اور اس اضطراب نے اس حد تک ترقی کی کہ مشرق کے ممتاز ترین شعراء حافظ و غالب پر نکتہ چینیاں کی گئیں، ادب کے سرتاج سرور و آزاد کی ہتک کی گئی، اُن پر غلط الزامات عائد کیے گئے۔ اور یہ سب کس لیے۔ صحیح اعتراض کی خاطر نہیں بے لوث تنقید کی نیت سے نہیں، بے لاگ اظہار رائے کے خیال سے نہیں، نام و نمود کے لیے، پروپگنڈا کی خاطر، شہرت کے واسطے، غرض کوئی رکیک حرکت نہیں جو حصول مدعا کے لیے عمل میں لائی گئی ہو۔ ان تمام کو معائب کہیے یا محاسن، عیوب کہیے یا صفات، سب پوری اترنے والی، غلط بیانیوں اور غلط گوئیوں کا مجموعہ، شیخیوں اور مغالطوں کا مزروعہ، نکتہ چینیوں اور عیب بینیوں کا نمونہ

آیاتِ وجدانی ہے

جو ایک میرزا کی تصنیف ہے اور دوسرے میرزا کی تالیف، ایک میرزا کی مدح ہے اور دوسرے میرزا کی مداحی۔ ایک میرزا کی تخئیل نگاری ہے اور دوسرے کی تحسین نوازی۔

آپ کہتے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے واللہ
میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں۔

(۴)

فلسفیوں نے انسانی ذہانت کے تین درجے مقرر کیے ہیں ــــــ پہلے درجہ سے وہ لوگ تعلق رکھتے ہیں جو اپنی فطری استعداد و ذکاوت کی وجہ سے ہر شعبۂ حیات میں جدت طرازی کر سکتے ہیں۔ دوسرا درجہ اُن لوگوں سے متعلق ہے جو پہلے درجہ کے اشخاص کی جدت طرازی سے مستفید ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں، تیسرے درجہ میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں نہ جدت طرازی کی اہلیت ہے، نہ دوسروں کی جدت طرازی سے مستفید ہونے کی صلاحیت ــــــ پہلی صنف بہترین ہے اور کمیاب، کیونکہ وہ موجد طبقہ ہے، دوسری صنف قابلِ تحسین ہے کہ اُس میں مقلد بننے کی صلاحیت ہے، تیسری صنف نہ تو موجد اور محرک ہے نہ مقلد اور گویا نہ اس میں فطری ذکاوت ہے، یہ محصلہ ذہانت بھی اپنے وجود اور قیام کے لیے پہلے دو اصناف کی دست نگر ہے اور اُنھیں کی دشمن۔

میرے خیال میں ان تینوں کے سوا ایک اور طبقہ بھی ہے جس کی بابت شاید فلسفیوں سے فروگذاشت ہو گئی، وہ طبقہ جس میں متذکرۂ بالا تینوں طبقوں کے خصوصیات اجتماعی حیثیت سے پائے جاتے ہیں ــــــ اور اسی طبقہ کے ایک فرد کا نام میرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی یگانہؔ لکھنوی ہے اور دوسرے کا میرزا مراد بیگ شیرازی۔

میرزا مراد بیگ شیرازی بہ زعمِ خود تنقید کے پیغمبر ہیں، نہایت صحیح، بے لوث اور بے لاگ تنقید کرنے والے ان کی تنقید میں جھوٹی تعریف کا نام نہیں ہوتا، فرضی عیوب کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے معلومات فلسفہ میں، منطق میں، اخلاقیات میں، ادب میں، اتنے وسیع ہیں کہ ان کی تنقید میں علوم کی بوقلمونی اور فنون کی گوناگونی کا مرقع ہوتی ہیں، ان کا علم بے پناہ ہے، ان کی قابلیت بے تھاہ ہے، مثال کے طور پر لیجیے انھیں یہ معلوم ہے کہ "سوا اسے آتش ہے کون ہمزباں اپنا" میں دوسرے رکن پر تسکین اوسط کا زحافت واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس مصرعہ کی تقطیع مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن کے بجائے مفاعلن، مفعولن، مفاعلن فعلن سے ہو گی ــــــ انھیں اسکا علم ہے کہ غالبؔ کو شاعری کی زبان نہیں ملی تھی، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جو کچھ کہ سکتا تھا کہہ گیا ــــــ اُن کی معلومات میں یہ داخل ہے کہ میرزا یگانہ "پہلو نشینِ ٹیگور" اور "بالا نشینِ غالبؔ" ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول تک ہند نے صرف تین سخنور علی الاطلاق پیدا کیے، یگانہ، اکبر، ٹیگور ــــــ وہ یہ جانتے ہیں کہ یگانہ کے تمام اشعار میں کسی ایک کا بھی جواب دُنیا کے کسی شاعر کے کلام سے، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زبان کا ہو نہیں مل سکتا۔

میرزا یگانہ، جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے، فن شعر کے تمام نکتوں، ادب کی سب باریکیوں

زبان کے جمیع محاسن سے واقف ہیں۔ ان کو مشرقی علوم میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مغربی علوم میں اُستادانہ دخل ہے۔ حقائق و رموز فطرت انسانی پر کامل دسترس ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شہرت سطح ہند پر پانی کی لہر کے مانند پھیل گئی ہے۔ چونکہ میرزا مراد بیگ شیرازی مداح ہیں اور میرزا یگانہ ممدوح اس لیے میرزا یگانہ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جس کا میرزا مراد بیگ شیرازی کو علم ہے، نیز اسکے علاوہ بہت کچھ معلومات ہیں جس نے ان کے بحر کمال کو نہ صرف میرزا مراد بیگ شیرازی کے دریائے علم سے وسیع تر بنا دیا ہے بلکہ اُسے اتنی وسعت دے دی ہے کہ ایک کنارے سے دوسرا کنارہ نظر آنا تو درکنار مخالف ساحل کہیں ملتا ہی نہیں (سکندر نے ہزار دقتوں کا سامنا کیا کہ سمندر کی تھاہ معلوم کرے لیکن ناکام رہا، کاش اسوقت زندہ ہوتا تو علم کے اس بحر بے پایاں کا عرض معلوم کرنے کی کوشش کرتا) اس لیے میرزا یگانہ کے علم و فضل کا ذکر ہی فضول ہے مختصراً اتنا کہدینا کافی ہے کہ اُنھیں معلوم ہے، کہ "منشی فاضل" کی سند حاصل کر لینا دو بات ہے اور شعر و سخن پر محاکمہ کرنا اہل الرائے کا منصب ہے" ان کے ہاتھ میں ادبی فضا کی نبض ہے جس کی ہر حرکت سے، جس کی ہر چال سے، ہر تڑپ سے، وہ ملک کی ذہنیت، ملک کے ذوقِ شعری، ملک کے جذبۂ شاعر پرستی پر نہایت صحت کے ساتھ رائے زنی کر سکتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے کہ دیتے ہیں:-

"مژدہ باد اے اہلِ دل غالب پرستی ہو چکی　　　شورشِ شعرِ یگانہ آج ہر محفل میں ہے"

الٰہیات اور روحانیات پر اُنھیں کامل عبور ہے اور ان کی فطرت، ان کی طبیعت اتنی صاف گو، اتنی راستباز واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے اس لا انتہا علم کے راز کو چھپاتے نہیں بلکہ اس کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہلواتے ہیں کہ ان کا شعر

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں　　　معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

عالم بالا میں فرشتے ورد کرتے ہیں، اُنھوں نے ایک نئی منطق دریافت کی ہے جسکے ایک اصول کی بنا پر تو یہ جائز ہے کہ اگر کوئی غالب کو ان پر ترجیح دے تو وہ غالب کی تنقیص کریں اُسے گالیاں دیں اسکے کلام کی صوری اور معنوی خوبیوں سے آنکھ بند کرلیں، دوسرے اصول کے تحت یہ عین صواب ہے کہ خود پرستی و خود نمائی اس حد تک کی جائے کہ وہ عزازیل کے تکبر، شداد کی فرعونیت اور نمرود کے غرور سے بڑھ جائے، خود ستائی اس درجہ کی جائے کہ لوگ نیرو کو بھول جائیں نپولین کو فراموش کر دیں

ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

اور پھر اس کا دعوےٰ کیا جائے کہ خود ستائی ایک فرض ہے، ایک تبلیغ ہے، خود پرستی ایک ضرورت ہے

ایک حاجت ہے جو نبیوں نے بھی انجام دی اور ولیوں نے بھی، جو اماموں کی جانب سے بھی عمل میں آئی، اور فقیروں کی طرف سے بھی،

دراز دستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

یگانہ کی غزل

(۳)

ہر کتاب کی اشاعت کا کوئی مقصد ضرور رہتا ہے، بغیر کسی سبب کے، بلا کسی مطمح نظر کے، ایک صفحہ بھی نہیں لکھا جاتا "آیاتِ وجدانی" کو شروع کیجیے، مشکل سے دو چار صفحے پڑھیے گا کہ طبیعت منغص ہونا شروع ہو جائیگی، ابھی وسط تک آپ نہیں پہونچیں گے کہ مصنف اور مولف دونوں کی ذہنیت پر آپ کو ہنسی آنے لگے گی، اور کتاب ختم کرتے کرتے آپ یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ اس کتاب کے تین کھلے کھلے مقاصد ہیں، اور تینوں لائق طعن، قابل تشنیع، بجا طور پر لایق ملامت، صحیح اصول پر قابل نفرت —— ایسے مقاصد جن کی بنا پر حاجت ہے کہ اس کتاب کے ایک ایک حرف سے تعرض کیا جائے، ایک ایک لفظ کی اصلیت کھول دی جائے، ایک ایک جملے کی دھجیاں اڑا دی جائیں، ایک ایک سطر کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے جائیں —— اصولی غلطیاں ایک طرف، واقعات کی غلط بیانی علیحدہ —— زبان کے اغلاط سے کتاب بھری پڑی ہے، صرف ایسی غلطیوں کی وضاحت کے لیے ایک دفتر درکار ہے، نمونے کے طور پر چند خامیاں ملاحظہ کر کے آپ اندازہ لگالیں گے کہ اس کتاب کی اشاعت و طباعت کے ذمہ دار کس لیاقت کے لوگ ہیں۔

زبان اردو نے گزشتہ چند سال میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، وہ اس زبان کو مکمل اور دوسری زبانوں کے "بار احسان" سے آزاد کرنے کے لیے کافی نہ سہی لیکن ایسی ضرور ہے کہ اب یہ کمزوری کہ اردو عبارت میں جا بجا، جا و بیجا، انگریزی اور دوسری غیر زبانوں کے الفاظ کو داخل کر کے عبارت کو نذر اردو رکھا جائے نہ انگریزی، یقیناً دور کی جا سکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ اردو اب بھی ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے اتنی غریب ہے کہ ٹھیٹھ اردو کے الفاظ مغربی خیالات کے حامل نہیں ہو سکتے،

گیسوِ اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

مگر فن مترجمی نے اس قلیل عرصہ میں جو رتبہ حاصل کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے غیر زبانوں کے الفاظ کا مترادف اردو ترجمہ عبارت میں لکھنا نہ صرف زیادہ مستحسن اور مستقل ہے بلکہ مستند بھی —— میرزا مراد نے جن تیوروں سے اس کتاب کو شائع کیا ہے اس سے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کا وسیع علم، انکا عمیق مطالعہ اس کتاب کو کیا عبارت، کیا زور تحریر، کیا پذیرائی مسائل و دلائل میں اول سے آخر تک ابتدا سے انتہا تک آغاز

ے انجام تک اسی ڈھنگ سے پہونچائے گا اور کسی کو کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہوگی لیکن جوں جوں کتاب کے ورق اُلٹتے جایئے پتہ چلتا جاتا ہے کہ

برباد کر رہا ہوں متاعِ ہنر کو میں

ہر ہر قدم پر انگریزی الفاظ، انگریزی محاورات، انگریزی عبارت، کی اتنی بھرمار ہے کہ دیکھنے والا شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کتاب دراصل اُردو میں لکھی گئی ہے یا انگریزی میں ——— پھر اگر انگریزی کے استعمال کا ایسا ہی شوق تھا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہر انگریزی لفظ سے پیشتر، ہر انگریزی محاورے کے پہلے اُسکا اُردو ترجمہ بھی لکھ دیا جاتا تاکہ غیر انگریزی داں طبقہ کو عبارت کے معانی و مطالب سمجھنے میں دقت نہ ہوتی لیکن عمل درآمد اسکے بالکل برعکس ہے بلکہ انگریزی الفاظ کا استعمال اُن مقامات پر بھی کیا گیا ہے جہاں آسانی سے اُردو کا سامنے کا لفظ مل سکتا تھا۔

صفحہ ۱۲ سطر ۹ فلاسفی استعمال کیا ہے درآنحالیکہ فلسفہ موجود ہے

صفحہ ۲۴ سطر ۱۵ اسپرٹ استعمال کیا ہے درآنحالیکہ روح اور جذبہ دونوں موجود تھے

صفحہ ۵۴ سطر ۹ جنرل بجائے عام کے استعمال کیا گیا ہے

صفحہ ۹۱ سطر ۱ کانشنس کے بدلے ضمیر کا لفظ استعمال ہو سکتا تھا

صفحہ ۱۶۴ سطر ۸ ماسٹر پیس کی جگہ شاہکار لکھا جا سکتا تھا

یہ ہیں چند نظیریں اُن الفاظ کی جن کے بجائے بالکل ہم معنی اُردو کے الفاظ بلا کسی کوشش و کاوش کے مل سکتے تھے۔ ان کے سوا تمام کتاب میں متعدد جگہ انگریزی الفاظ مثل Irony، Ideal، Originality وغیرہ کے استعمال کیے گئے ہیں جن کے اُردو مرادفات کی طرف کتاب بھر میں کہیں بھی اشارہ نہیں ہے۔

یہ تو ایک ایسا سامنے کا نقص ہے جس پر ہر شخص کی نظر فوراً پڑیگی اور جو کسی باخبر اور فہمیدہ اُردو داں کی تحریر میں نہ ملیگا۔ اسکے علاوہ میرزا لے شیرازی نے اکثر موقعوں پر ایسی رکیک اور متانت سے گری ہوئی عبارت لکھی ہے جو کسی مہذب اور سنجیدہ انسان کو کسی حالت میں نہ لکھنا چاہیے۔ آخر تہذیب اور متانت بھی تو کوئی شے ہے۔

صفحہ ۳۱ سطر ۸ "جو آگ کھاؤگے تو انگارے ......"

صفحہ ۳۲ سطر ۹ "علمائے لکھنؤ کی جوتیوں کو کیا غرض پڑی تھی"

صفحہ ۴۳ سطر ۳ "کبڈی مارتا ہوا مکے مدینے یا لندن پہونچ جائے"

صفحہ نمبر ۱۲۵ سطر نمبر ۳ "غالب کے بدندیت تو ہر طرف چھوٹے ہوئے ہیں"

کیا یہ جملے کسی مہذب اُردو نویس، کسی متین مضمون نگار کے قلم سے نکل سکتے ہیں اور یہ صرف "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ صدہا غلطیاں ہیں جن میں سے بعض کو تو کھینچ تان کر کتابت کے نقائص میں شامل کیا جا سکتا ہے گو اس میں مجھے بہت کلام ہے کیونکہ پوری کتاب سے میرزا صاحب کے علم و فہم کا پتہ چل رہا ہے

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

صفحہ نمبر ۲۷ سطر نمبر ۷ "مگر لکھنؤ میں ایک کمرے پر سائل دہلوی کی زبان سے اچانک کچھ ایسا لفظ نکل گیا تھا" الفاظ "کمرے پر" میں جو رکیک اور ذم کا پہلو ہے اسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

صفحہ نمبر ۴۸ سطر نمبر ۹ "ورنہ میرزا صاحب کے طرز زندگی پر غور کی جائے"

کیوں جناب میرزا امراؤ صاحب، یہ غور مونث کب سے ہو گیا۔ کیا اب الفاظ میں بھی آپ کے یہاں عمل جراحی سے تبدیل صنف کی جا سکتی ہے، جہاں تک مجھے علم ہے غور دلی، لکھنؤ کہیں بھی مونث نہیں بولا جاتا، پھر مذکورہ بالا جملہ کانوں کو کسقدر گراں گزرتا ہے۔ کاش میرزا امراؤ صاحب کے کانوں میں یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ "سماعت پر گرانی" کا اندازہ کر سکتے۔

صفحہ نمبر ۶۱ سطر نمبر ۱۵ "مگر وائے بر حال میرزا یگانہ کے"

اس جملے کی داد تو بجز میرزا امراؤ کے اور کوئی شاید دے سکے اگر کسی کی طرف سے اسکا امکان ہو تو وہ میرزا یگانہ ہیں۔

صفحہ نمبر ۲۳۱ سطر نمبر ۱۲ "کیا براہ کرم ٹیگور اور غالب کا مطالعہ کرنے والے میرزا یگانہ کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہی مکمل نمونے پیش کر سکتے ہیں" —— اس جگہ براہ کرم کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کا استعمال کس قدر صحیح ہوا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میرزا امراؤ بیگ نثر نویسی میں اسی طرح یکتائے روزگار ہیں جس طرح میرزا یگانہ شعر گوئی میں۔

یہ تھے چند نمونے میرزا امراؤ بیگ شیرازی کے زور قلم کے: آپ انکو دیکھکر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جناب میرزا صاحب کس پایہ کی اُردو لکھتے ہیں۔

اسکے علاوہ یہ غلطی کہ کہیں مخاطب آپ سے کیا گیا ہے اور کہیں تم سے، تو بہت عام کیا کتاب میں موجود ہے، کہیں میرزا صاحب نے اپنے لیے ہم استعمال کیا ہے کہیں میں، اہل زبان اور اہل قلم کے لیے یہ امر جس قدر معیوب ہے وہ سب ارباب ذوق اور اصحاب نظر پر خوب واضح ہے۔ مثال کے لیے میں صرف ایک نمونہ پیش کرتا ہوں۔

صفحہ ۱۷ سطر ۱۵ "آنکھیں کھولیے اور غور سے دیکھیے کہ اس عظیم آبادی کی نسبت یہ کہنا کہ اس خود پرستی کی کیا ضرورت ہے آپ میں جوہر ہوگا تو بیاب خود یہ کہہ لیگی ذرا غور تو کرو کہاں تک ٹھیک ہے"۔

ابتدا میں کھولیے اور دیکھیے اور آخر میں غور تو کرو۔ یہ کہاں تک درست اردو کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ مزید براں اس پورے جملہ کی ساخت پر غور کیجیے اور دل ہی دل میں اس شخص کی اردو نویسی کی داد دیجیے جسکے قلم سے یہ اور اسی قسم کے متعدد جملے نکلے ہیں اور جو اس پر بھی اس کا مدعی ہے کہ اس کا سا اردو لکھنے والا آج روئے زمین پر نہیں۔

(۴)

تمام کتاب میں ابتدا سے انتہا تک خواہ دیباچہ ہو خواہ محاضرات۔ کہیں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ جہاں کوئی دعویٰ کیا جائے وہاں اس دعوے کے لیے کوئی دلیل بھی ہو جس جگہ کوئی ادعا کیا جائے وہاں اس کی تائید میں براہین پیش کیے گئے ہوں اگر کسی نقاد پر بھولے سے کسی بیان کا ثبوت دیا بھی گیا ہے۔ کسی امر کے لیے دلیلیں پیش کی بھی گئی ہیں تو وہ منطق سے بالکل بیگانہ اصول بحث سے بالکل علیحدہ، قواعد مباحثہ سے یک لخت خالی — مضمون کی طوالت کے خوف سے میں صرف چند مثالیں اس نوع کی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

صفحہ ۵ و ۶ پر تحریر ہے۔

"اگلے اساتذہ کے دواوین تو موجود ہیں مگر ان کے سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں۔ اس لحاظ سے میں نے اس دیباچہ میں مصنف کے حالات زندگی اور طرز زندگی کو زیادہ واضح کر دیا ہے"

میرزا مراد بیگ شیرازی نے میرزا یگانہ کے حالات زندگی اور طرز زندگی کے متعلق جو کچھ دیباچہ میں رقم فرمایا ہے وہ مختصراً یہ ہے — "میرزا یگانہ کے خاندانی حالات، ان کا سلسلۂ نسب، انکی شادی، ان کے ذوق شاعری کی نشو و نما اور پرورش۔ ان کے قیام لکھنؤ کے واقعات، اور انکی خود پرستی کے وجوہ" — ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ "اگلے اساتذہ کے سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں" کون سا ایسا مشہور شاعر ہے جسکے سوانح حیات کے متعلق اردو میں کم سے کم اتنا ہی مواد موجود ہو جتنا "آیات وجدانی" سے میرزا یگانہ کی بابت ابتدائی کون سا ایسا استاد ہے جسکے حالات اور طرز زندگی کے متعلق ہمیں میرزا یگانہ کے حالات سے کمتر واقفیت ہے۔ میر، غالب، امیر، انیس ان لوگوں کو ابھی رہنے دیجیے ان کے متعلق تو اردو میں مستقل کتابیں

موجود ہیں جن سے ہمیں ان اساتذہ کے متعلق دس درجہ زیادہ علم حاصل ہوتا ہے۔ سودا، ذوق، مومن، آتش و ناسخ، داغ، درد، شیفتہ، رند، وزیر، مصحفی و انشا، نسیم و چکبست، کس کی بابت ہمیں اتنی معلومات نہیں جتنی میرزا ماہر نے آیاتِ وجدانی میں میرزا یگانہ کی بابت جمع کی ہیں، آبِ حیات کو لے لیجیے، مذکورہ بالا متعدد شعرا کے حالات اس میں قریب قریب اتنی ہی تفصیل اور وضاحت سے درج ہیں، پھر ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو اسی موضوع پر کثیر معلومات فراہم کرتی ہیں، شعرالہند، گُلِ رعنا، خمخانۂ جاوید، کس کس کا نام لیا جائے۔ کیا ان تذکروں میں قدیم اساتذہ کی بابت اتنا بھی ذخیرہ نہیں ہے جتنا آیاتِ وجدانی میں میرزا یگانہ کی بابت ہے ــــ اب آئیے یادگارِ غالب، یادگارِ انیس، موازنۂ انیس و دبیر، طرۂ امیر، سوانحِ امیر، حالاتِ میر پر ــــ کیا یادگارِ غالب میں غالب کا نام و نسب مذکور نہیں ہے، غالب کے طفلی و شباب کے حالات نہیں مرقوم ہیں، اسکی معاصرین سے نوک جھونک، اس کا طریقۂ زندگی، اسکے واقعاتِ حیات، ان امور کے متعلق آیاتِ وجدانی سے بہتر صورت میں زیادہ مواد نہیں موجود ہے۔ کیا امیر کے حالاتِ زندگی، انکے عروج کے مختلف ادوار کا ذکر، داغ سے ہچشمی کے تذکرے، طرۂ امیر اور سوانحِ امیر میں تفصیل سے نہیں ملتے ہیں، میر اور انیس کے متعلق ایک چھوڑ دو دو کتابیں موجود ہیں مفصل، مبسوط، جامع، اور پھر بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو اس کے مدعی ہیں کہ ان شعرا کے متعلق کوئی معتبر کتاب نہیں ملتی ــــ کوئی شک نہیں کہ ابھی مشرق میں لوگوں کو ادب اُردو سے اتنا شغف نہیں پیدا ہوا ہے کہ وہ اسکے مشاہیر اساتذہ کے حالاتِ زندگی کی بابت اتنی ہی کد و کاوش کریں، اتنی ہی تحقیق و تدقیق کریں جتنی اہلِ مغرب اپنے شعراء اور نثر نگاروں کے لیے کرتے ہیں، مغرب کے باشندوں نے شیکسپیر کی حیات کے ایک ایک منٹ کا حال دریافت کیا ہے، چاسر کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، ڈکنس کی لائف (حیات) کے ہر ہر پہلو کو واضح کر دیا ہے، لیکن کیا مشرق میں مغرب کی تقلید سودمند ہوگی کیا اہلِ مشرق کو ان امور کے متعلق دیدہ ریزی سے کوئی مزید منفعت حاصل ہو سکے گی؟ علاوہ بریں بحث تو یہاں اس سے ہے کہ کیا میرزاے شیرازی نے میرزا یگانہ کی بابت آیاتِ وجدانی میں اسی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے، اسی دماغ سوزی اور تحقیق کی کوشش کی ہے جو اہلِ مغرب اپنے اساتذہ کے متعلق کرتے ہیں ــــ بہر حال جس پہلو سے نظر ڈالیے آپ اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ میرزا یگانہ کے جو حالات آیاتِ وجدانی میں مندرج ہیں اُن کو دیکھتے ہوے میرزاے شیرازی کا یہ دعوےٰ کہ اگلے اساتذہ کے متعلق ہم کو کوئی مفصل معلومات نہیں، نہ صرف غلط ہے بلکہ مہمل اور واقعات کے بالکل خلاف۔

صفحہ ۱۲ پر مرقوم ہے :-

"ان حسد شعاریوں نے میرزا صاحب کے دشمنوں کی کمزوریوں کا یقین دلا دیا اور اسی کے ساتھ ان کی خود پرستی کی نشو و نما ہونے لگی"

عجیب غریب منطق ہے ۔ حسد شعاریاں دشمنوں کی کمزوریوں کا ثبوت تو ضرور ہو سکتی ہیں لیکن جذبۂ خود پرستی و خود ستائی کی محرک، مادۂ تعلی و شیخی کی متحرک کیونکر ہو سکتی ہیں ۔ خود پرستی اگر وہ خود پرستی ہوتی جو میرزا مراد بیگ شیرازی نے رسول اکرمؐ اور مولائے مشکل کشا سے منسوب کی ہے تو مضائقہ نہ تھا، خود ستائی اگر وہ خود ستائی ہوتی جسے آیاتِ وجدانی میں سیدنا امام حسینؑ سے نسبت دی گئی ہے تو چنداں حرج نہ تھا تعلی اگر اعتدال کے حدود میں رہتا تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ شیخی اگر با سبب ہوتی تو کسی قسم کا احتجاج نہ تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ خود پرستی اور خود ستائی کی دھن میں، تعلی اور شیخی کے جنون میں تمام مجادوں سے قطع نظر کر لی گئی، سب حدود کو خیرباد کہہ دیا گیا، غلط گوئی اور مغالطہ دہی کا بازار گرم کر دیا گیا، سہواً نہیں بھول کر نہیں، قصداً ارادتاً، عوام کو دھوکا دینے کی خاطر، پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کی غرض سے، پیغمبروں اور اماموں کے اظہارِ حق کو، ولیوں اور درویشوں کی سعی وضاحت واقعات کو، میرزا یگانہ کی خود غرضانہ تعلی سے منسوب کیا گیا، جرأت مایانہ خود پرستی سے نسبت دی گئی، عیارانہ خود ستائی سے مقابلہ کیا گیا، بیباکانہ شیخی سے موازنہ کیا گیا اور اس غرض کے لیے فلسفے کی ٹانگ توڑ دی گئی، منطق کی دھجیاں بکھیر دی گئیں، تاریخ کے پرزے اڑا دیے گئے

نا ریل جیسے لگا ہاتھ وہ ..... ہوں میں

صفحہ ۳۲ پر گہر افشانی ہوتی ہے :-

"بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین سخنوران علی الاطلاق پیدا کیے ، اکبر، ٹیگور، اور یگانہ"

پچھلے اساتذہ تو دور رہے، اُن میں تو کوئی سخنور تھا ہی نہیں، اُن میں سے تو کسی میں ذکاوت و ذہانت تھی ہی نہیں، موجودہ دور کے مسلم الثبوت شعرا، مانے ہوئے سخنور ——— ڈاکٹر اقبال اور مسز سروجنی نائیڈو ——— بھی کسی شمار میں نہیں آتے، انکی شاعری میں بھی کہیں حقیقت کی جھلک میرزا صاحب کو نہیں نظر آئی، انکے کلام میں بھی کہیں حسنِ معنوی، کسی جا او صافِ ظاہری کے نمونے میرزا صاحب کو نہیں ملے، ان کے جذبات میں بھی کہیں رفعت کا پتہ نہیں چلا، ان محاسن کا وجود میرزا صاحب کو ملا تو کہاں، میرزا یگانہ کے تخیل میں، میرزا یگانہ کے تغزل میں،

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اور اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ اکبر اور ٹیگور کی شہرتیں ان کی مادی زندگی کی کامیابیاں ان کی شاعری کے غلغلے محض مبالغہ ہیں، اصلیت سے کوسوں دور ہیں، پروپیگنڈے کا نتیجہ ہیں بس حضرت یگانہ کا کلام ایسا ہے جو وجدان صحیح کا مظہر ہے، جو حقایق و معارف کا گنجینہ ہے، جو کمالات معنوی کا آئینہ ہے، اور جو مبالغہ اور جھوٹی شہرت سے یک لخت معرا ہے۔

صفحہ ۳۹ پر یوں خامہ فرسائی کی جاتی ہے

"افسوس ہے کہ ہندوستان کے بہتیرے تعلیم یافتہ اصحاب نے نیچرل شاعری کا مفہوم بس اتنا سمجھ لیا ہے کہ مظاہر اور مرئیات کی بے سود نقالی کی جائے، جیسے مینہ جھما جھم برس رہا ہے کوئل کوک رہی ہے، دریا بہہ رہے ہیں، چشمے اُبل رہے ہیں، آبشاروں سے سریلی صدائیں آرہی ہیں، بھلا اس قسم کی بیہودہ اور بے نتیجہ محاکات سے انسانی جذبات کی گہرائیوں پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے نیچرل شاعری کا صحیح مفہوم تو یہ ہے کہ مناظر و مظاہر واقعات و واردات کے مشاہدے سے فطرت انسانی میں جو فاعلی و انفعالی کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی جائیں۔ محض بے نتیجہ محاکات کوئی شاعری نہیں ہے"

صفحہ ۱۸۸ پر پھر میرزا صاحب نے اسی خیال کا اعادہ کیا ہے وہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ اس نے نیچرل شاعری کا مفہوم غلط سمجھ رکھا ہے حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ خود میرزا صاحب نے نیچرل شاعری کے معانی سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے اس نظریہ کے بیان میں ایسے الفاظ استعمال کر گئے ہیں جو کسی طرح تنقید کے شایان شان نہیں، قدرتی مناظر کا اظہار کرنے والی شاعری کو "بیہودہ محاکات" کہنا کہاں تک مناسب ہے، مظاہر و مرئیات کو "بے سود نقالی" سے تعبیر کرنا کس حد تک صحیح ہے۔ اصل میں میرزا صاحب قدرتی شاعری اور فطری شاعری میں دھوکا کھا رہے ہیں، وہ جسے نیچرل شاعری سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں قدرتی شاعری ہے فطری شاعری نہیں، اور قدرتی شاعری کا مفہوم بعینہ وہی ہے جو آجکل کے تعلیم یافتہ طبقے نے سمجھ رکھا ہے۔ اس میں صرف وہی اصناف سخن داخل ہیں جنہیں موجودہ زمانے کے مغربی خیالات سے متاثر شعراء نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ مشہور انگریزی شاعر ورڈس ورتھ (Wordsworth) کی شاعری پر بھی کسی زمانہ میں بعینہٖ اسی قسم کے اعتراضات کیے گئے تھے جنکا جواب نہایت مدلل اور دنداں شکن دیا گیا، خصوصاً ... نے جو مقالہ جواب میں لکھا وہ بے نظیر ہے۔ میرزا مراد بیگ شیرازی

نے جو طریقہ اس کتاب میں ابتدا میں اختیار کیا ہے جس طرز سے اُنھوں نے آغاز کتاب میں اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے اس سے ہر شخص کو لا محالہ یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے ان کے مقالے کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا علم محض سطحی ہے اور انکی واقفیت ان امور میں بالکل ابتدائی، ان کا دماغ شاعری کی گہرائیوں، شعر کی باریکیوں تک پہونچا ہی نہیں ہے، وہ اگر غور کرتے تو انھیں پتہ چلتا کہ کوئل کے کوکنے کا منظر، دریا کی آہستہ خرامی کا نظارہ، آبشاروں سے سُریلی صداؤں کے آنے کا سماں، بے سود نقالی، بے نتیجہ محاکات نہیں ہیں جو اُنھوں نے اپنی کم علمی اور بے مائگی کی بنا پر سمجھ رکھا ہے۔

شیکسپیر نے اپنے مشہور طربیہ ڈرامے (As you like it) میں ایک جگہ لکھا ہے

درختوں میں زبانیں مضمر ہیں (There are tongues in trees)

بہتے ہوئے چشموں میں صحیفے پوشیدہ ہیں (Books in running brooks)

اور پتھروں میں حقایق معرفت چھپے ہوئے ہیں (and sermons in stones)

قدرت کے خوبصورت اور خوشنما مناظر کا خاکہ کھینچنے سے شاعر کا مقصد صرف ان مناظر کا اظہار نہیں ہے بلکہ ہر منظر سے انسان کو ایک سبق دینا ہے، ہر سماں سے ہستی کو ایک بار یک فلسفہ سمجھانا ہے، ہر نظارہ سے کور باطنوں کو حقائق و معارف قدرت الٰہی کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھوانا ہے۔ میرزا صاحب کی نظر شاعری کے صرف اُس پہلو پر پڑتی ہے جس میں فطرت انسان کی کیفیتوں کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی جائیں، جس میں صرف انسان اور اُسکے متعلقات سے بالراست بحث کی جائے۔ وہ قصداً یا سہواً شاعری کے اور پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ مذکورہ بالا پہلو گو شاعری کا اہم ترین پہلو ہے مگر صرف ایک، شاعری کے اور بھی متعدد پہلو ہیں جن تک جانبدار نظریں شاید نہیں پہونچ سکتیں، میرزا صاحب کو اگر ان پہلوؤں پر شاعری کے نمونے دیکھنا ہوں تو انھیں چاہیے کہ ورڈسورتھ (Wordsworth) راززٹی (Rosetti) کیٹس (Keats) اسکاٹ (Scott) ہارڈی (Hardy) ایمرسن (Emerson) رومی، اور اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کریں۔

صفحہ ۵۵ پر میرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں

"مگر بالغ نظروں کو اس کا بھی اندازہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ خودی کی جو تعلیم دی ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتی ہے اگر حضرت مرزا غلام نے فلسفہ خودی و خودداری کی محض نظری تعلیم نہیں دی ہے

بلکہ عملی بھی۔ آپ کی زندگی سے اس بات کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔"

میرزا صاحب اس جگہ یا تو اتنا زبردست دعوٰی کر رہے ہیں جو کسی بالغ عقل کے انسان کو نہ کرنا چاہیے، یا قصداً واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے عوام کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اقبال نے جو تعلیم اس مسئلہ پر دی ہے وہ گو ایک حد تک نظری ہے مگر اتنی بلند، اتنی مفصل، اور اتنی جامع ہے کہ اسکے سامنے یگانہ کا تمام فلسفہ خودی و خودداری ہیچ ہے۔ علاوہ بریں میرزا یگانہ نے جو گنتی کے چند اشعار دے دیئے ہیں (بندش تو ہر شخص کر لیتا ہے) اس مسئلہ پر کہے ہیں انکی بابت یہ کہنا کہ وہ فلسفہ خودی کی عملی تعلیم دیتے ہیں کیونکہ یگانہ کی زندگی خودی و خودداری کا نمونہ ہے کہاں تک منطقی اصولوں کے تحت صحیح ہو سکتا ہے۔ ہر شاعر انسان ہونے کی حیثیت سے سوسائٹی کا ایک جزو ہے اور اس لحاظ سے اسکی عملی زندگی سوسائٹی کے حدود کے اندر سوسائٹی کے دوسرے اجزاء اور افراد کے لیے ضرور نمونہ عمل بن سکتی ہے لیکن شاعر کے روزمرہ کے سوانح سے اسکے اشعار کے معانی نکالنا، اسکے خیالات کو مطالب کا جامہ پہنانا، اس کی تخیل کی تزئین کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئل کی کوک سے اس کی خوبصورتی اور خوشنمائی کا تصور کرنا۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو شاید دنیا کے کسی شاعر کے فلسفہ حیات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ داغ کے حالات زندگی کو اس کے مخصوص رنگ سے تو منطبق کر سکیں گے لیکن اس کے اور کلام مثلاً مناجاتوں، نعتیہ غزلوں کو کس طرح متعلق کریں گے۔ آپ امیر کے حالات زندگی کے مدنظر ان کے نعتیہ دیوان، اور مراۃ الغیب کی توضیح کر سکیں گے لیکن صنم خانہ کو کس ضمن میں لائیے گا، پھر دور کیوں جایئے، اقبال کے طرز زندگی کو انکے مشاغل کو انکی شاعری سے کس طرح مطابق کیجیے گا۔ حافظ کے کلام کو کس نظر سے دیکھیے گا ـــــ اسی لیے میں نے یہ عرض کیا کہ شاعر انفرادی شخصی حیثیت سے تو ضرور اپنی زندگی کو نمونہ عمل بنا سکتا ہے لیکن اسکے افعال اور اعمال کی بنا پر اسکا مدعی ہونا کہ اسکے اشعار جو نفس محض نظری حیثیت رکھتے ہیں کسی نوع کی عملی تعلیم دیتے ہیں صرف "حسن ظن" ہے۔

صفحہ ۶۲ پر میرزا صاحب ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف یوں زہر اگلتے ہیں

"اگر یہی میرزا یگانہ یورپ میں ہوتے تو غیر ممکن تھا کہ وہاں کی زندہ قومیں آپ کے آیات وجدانی اور کمال سخنوری کی طرف سے چشم پوشی کرتیں"۔

بسم اللہ، میرزا یگانہ یورپ کو بھی اپنا وطن بنا کر دیکھ لیں، در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ آیات وجدانی میں میرزا سے شیرازی نے جو نقشہ میرزا یگانہ کے کمالات کا کھینچا ہے اور جو داگ انکی ذہانت

اور طباعی کے گن گائے ہیں انکی بنا پر تو یہ قیاس کچھ غلط نہ ہوگا کہ میرزا یگانہ کے لیے اتنی انگریزی یا فرانسیسی سیکھ لینا کہ ان زبانوں میں شاعری کر سکیں کچھ زیادہ دشوار اور وقت طلب کام نہیں شوق سے سیکھیں، اور ان دونوں زبانوں میں سے کسی میں اتنی ہی شاعری فرمائیں جیسی اردو یا فارسی میں فرماتے ہیں، پھر دیکھیں کہ انگریز یا فرانسیسی اس کی کیا قدر کرتے ہیں اور ان کی کیا درگت ——— میرزا شیرازی کو ہندوستان کی اچھی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ہندوستان نے انکے میرو میرزا یگانہ کی قدر نہیں کی، بیشک ہندوستان اور اس کے باشندوں میں ابھی وہ آزادیِ خیالات اور وسعت نظر نہیں پیدا ہوئی ہے جو مغرب کے باشندوں میں اس درجہ عام ہے مگر کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ واقعات کو غلط ظاہر کر کے ہندوستان پر باوجود اتنے سب درست الزامات کے ایک غیر درست اتہام بھی لگا دیا جائے۔ میرزا صاحب نے اہل ہند کو جس ناقدری کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، مغرب آج اپنے باعظمت لوگوں کی قدر کر رہا ہے مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مغرب کے قابل اور لائق نثار، بلند نظر اور بلند تخیل شعراء اسی طرح دربدر پریشان حال خستہ نوال پھرتے اور فقدان مذاق، عدم وقعت، اور ناپیدائی قدر، کی شکایت کرتے تھے، اور اب بھی مغرب وہ مغرب نہیں ہے جسکا تصور میرزا صاحب کے ذہن میں ہے جس کی بابت انھوں نے اتنے شیریں اور دل خوش کن خواب دیکھے ہیں۔ آج بھی مغرب کے دامن پر اس کی ناقدری کا دھبہ ہے آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) کی بے وقعتی کا داغ ہے — میرزا صاحب کا بیان ان کی تاریخی ناواقفیت کی بھی دلیل ہے شیکسپیر، مارلو، اسٹیونسن، جانسن، وولٹیر، ٹالسٹائے، وغیرہ نے جس کس مپرسی اور تنگدستی کی حالت میں اپنی حیات کے بیشتر ایام بسر کیے اسکا علم ہر ادب سے ذوق رکھنے والے کو ہونا چاہیے۔ جناب میرزا صاحب دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں لائق اشخاص کی ناقدری نہ ہوئی ہو، جہاں علماء اور فضلاء کی مٹی نہ پلید ہوئی ہو، جہاں ذہانت اور ذکاوت پر خاک ڈالنے کی کوششیں نہ کی گئی ہوں، خود اپنی اور میرزا یگانہ کی مثال لیجیے، آپ دونوں حضرات نے غالب کی تنقیص میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہے، اسکی شہرت پر حرف لانے میں کوئی کمی چھوڑ رکھی ہے آپ ہی کے سے اللہ کے بندے اور دیگر ممالک میں بھی ملتے ہیں۔ پھر بھی آپ کو یہ شکایت ہے کہ ہندوستان میں صحیح اور سچی قدردانی نہیں ہوتی۔ باوجود اسکے آپ کو گلہ ہے کہ مشرق میں نااہلوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، ذرا پہلے اپنے آپ کو تو دیکھیے۔ منہ ذرا اپنے گریبان میں ڈالا ہوتا۔

(Flood)

مذکورۂ بالا نقل شدہ عبارت کے بعد ہی میرزا صاحب چند ایسے جملے لکھتے ہیں جنکا مطلب سمجھنے سے کم از کم میں بالکل قاصر ہوں، آخر ان کا مطلب اعلیحضرت شہریار دکن اور مہاراجہ محمود آباد کی خدمات میں مبارکباد کے تار روانہ کرنے سے کیا ہے، اس سلسلہ میں جو بات انھوں نے سب سے زیادہ قابل اعتراض اور لغو لکھی ہے وہ اُن کا نواب صاحب رامپور پر حملہ ہے۔ آیات وجدانی ۱۹۲۶ء کی نوشتہ ہے، اسوقت نواب حامد علی خاں صاحب جنت مکاں بقید حیات تھے، ان کے وہ افعال جو اُن کی ذات تک محدود تھے خواہ کیسے ہی ہوں لیکن اُن کی بابت یہ غلط بیانی کہ "اُنھیں اہل علم کا درد کیوں ہونے لگا" محض تہمت ہے۔ شاید میرزا لے شیرازی کو اسکا علم نہیں یا اُنھیں اس علم کے باوجود مغالطہ دہی میں مزا آتا ہے کہ نواب حامد علی خاں صاحب مغفور کی ذات باوجود اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے نعمتہائے روزگار میں سے تھی۔ ان کی علم دوستی اور غربا پروری کے ایک نہیں سیکڑوں نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں، میرزا صاحب ہندوستان کے والیان ممالک کے متعلق کوئی مستند کتاب دیکھتے تو انھیں اس کا پتہ چلتا کہ رامپور کی ریاست سے کتنے مدرسوں، کتنے اسکولوں، کتنے علمی اداروں کو امداد ملتی تھی، رامپور کے دربار سے کتنے علماء، کتنے شعراء، کتنے اداء کے مشاہرے مقرر تھے، اس میں شک نہیں کہ اُنکے دور میں رامپور میں علم کے وہ درخشاں نورتن جمع نہیں تھے جن سے نواب خلد آشیاں کا دربار جگمگاتا تھا لیکن باوجود اس کے اپنے عہد میں رامپور کے اس عالی ظرف حکمراں نے اپنی ریاست کی قدیم روایات کو بڑی حد تک برقرار رکھا تھا، اس نے سیکڑوں علمی اداروں کی ہمت افزائی کی اور بے دریغ، لاکھوں ادبی اسکیموں میں حصہ لیا اور بے دھڑک، شاہانہ ظرف سے نلو یا نہ ہمت سے، اسکا دخل نہ ہوتا اگلی مدد نہ ہوئی ہوتی تو آج سیکڑوں کتابیں غیر مطبوعہ ہوتیں، ہزاروں رسائل ناپید ہوتے۔ ایسے علم دوست حکمراں کی بابت اتنی غلط گوئی کہ اُس پر علم اور علم والوں سے دشمنی کا الزام لگایا جائے خبث نفس کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

صفحہ ۶۴ پر میرزا ے شیرازی مدعی ہیں کہ

"خواجہ آتش اور میر تقی میر کی زندگی بھی اس کس مپرسی میں نہیں گذری تھی جس میں میرزا یگانہ کی گزر رہی ہے اور ان دونوں حضرات نے بھی اپنی شان خودداری اس طرح برقرار نہیں رکھی تھی جس طرح میرزا یگانہ نے رکھی"

مجھے میرزا یگانہ کے سوانح حیات کا مفصل علم نہیں کہ میں تحقیق سے کہہ سکوں کہ آیا اُن پر اتنے ہی

مصائب و آلام گزرے ہیں جتنے خواجہ آتش یا میرؔ پر بیتے تھے، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں نے جس خودداری اور جس آن بان سے زندگی گزاری اس کی ہوا بھی اگر میرزا یگانہ کو لگ جاتی تو آج مجھے یہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہوتی۔ کیا میرزا صاحب کے نزدیک صرف فاقہ کرنا خودداری ہے، صرف ہجو کا جواب نہ دینا خودی ہے، کیا اپنی شان میں قصیدے پر قصیدے لکھنا، اپنی خود پرستی اور خودستائی میں خطبے کے خطبے پڑھنا، اپنی خودنمائی اور اپنی بڑائی میں قطعات کے قطعات کہنا خودداری ہے، کیا اساتذۂ قدیم و جدید پر اتہامات لگانے کو ان کے ادبی کارناموں کی تنقیص و تذلیل کرنے کو خودداری کہا جا سکتا ہے، کیا اپنے ہمعصروں کی تضحیک کرنے کو خودی سے موسوم کیا جا سکتا ہے، کیا خواجہ آتش نے کبھی بھی شیخ ناسخ کے لیے یہ سلوک روا رکھے تھے، کبھی بھی اُن کی بُرائی کی تھی، کسی وقت بھی اُن پر بہتان لگائے تھے، ایک بار بھی ان کی شہرت اور قابلیت کے خلاف پروپیگنڈا کیا تھا۔ کیا میرؔ نے باوجود سوداؔ کی طرف سے ہجو کہے جانے کے کہیں بھی سودا کو یوں ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی، کیا میرؔ نے کسی وقت بھی اساتذہ پر یوں بیجا اعتراضات کیے تھے۔ کیا لکھنؤ والوں نے اقبال کے کلام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا رکھا تھا، لیکن کیا کبھی ڈاکٹر اقبال نے بھی اُسی نوع کے جوابات دیے، پھر آج یگانہ اور اقبال کا مقابلہ کر لیجیے، اقبال کو دنیا میں کون نہیں جانتا اور یگانہ کو کون جانتا ہے،

قسمت بادہ باندازۂ جام ست اینجا

آتش نے زیادہ سے زیادہ کیا تو یہ غزل کہی — سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ——
میرؔ کو بہت بُرا معلوم ہوا تو اُنھوں نے یہ قطعہ پڑھا۔ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ——
کیا میرزا یگانہ نے بھی اسی پر اکتفا کی، اور پھر بھی میرزا مراد بیگ کو دعویٰ ہے کہ میرزا یگانہ نے آتش اور میرؔ سے زیادہ خوددار زندگی بسر کی ہے۔

صفحہ ۲۱۵ پر پھر میرزا مراد صاحب ایک ایسی بات تحریر فرماتے ہیں جس کا نہ اُلٹا سمجھ میں آئے نہ سیدھا، اور وہی پُرانی چال کہ نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی برہان، جو جی میں آیا لکھ دیا۔ فرماتے ہیں:—

"دنیا میں بہتیری باتیں جس قدر مشہور اور مسلم ہوتی ہیں اُسی قدر غلط اور بے معنی ہوتی ہیں"
پہلے تو لفظ بہتیری کی فصاحت پر غور کیجیے، پھر غلط اور مسلم کے اجتماع کی بوالعجبی پر، ان مراحل کے

بعد اب اصل مسئلے کی طرف توجہ منعطف کیجیے کہ وہ منطق کے کن اصولوں کی بنا پر درست ہے، واقعات کے کس سلسلہ کی پشت پناہی پر صحیح ہے، حالات کے کس مجموعہ کی بنا پر قابل وثوق ہے۔ یہ امر مسلّم اور مشہور ہے کہ شیکسپیر دنیا کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار تھا کیا یہ امر اسی نسبت سے غلط اور بےمعنی ہے، یہ کلیہ مسلم اور مشہور ہے کہ زمین میں کشش ارضی ہے، کیا یہ کلیہ غیر صحیح ہے، یہ بات مسلّم ہے کہ دھیان چند ہاکی کا سب سے عمدہ کھلاڑی ہے، کیا یہ دعویٰ نادرست ہے، یہ خبریں سب کی سب بہت مشہور اور مسلّم ہیں کہ "وکٹوریہ بہت اچھی ملکہ تھی قلوپطرہ بہت حسین وجمیل عورت تھی، روما کی سلطنت بہت وسیع اور طاقتور تھی، یونان کی تہذیب بہت اعلیٰ اور ارفع تھی، عرب کے باشندے آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل بہت وحشی اور غیر مہذب تھے، ہلٹن عدیم المثال سخنگو تھا" — کیا یہ سب اخبار لایعنی اور مہمل ہیں زندگی کے ہر شعبہ سے یہ مثالیں جمع کی گئی ہیں، دنیا کے ہر خطہ سے یہ نظائر پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تو میرزا صاحب غلط اور بےمعنی ثابت کر دیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مسلّم موروثیت کے کسی ایک پہلو پر کبھی کمزور ثابت ہوئے ہوں لیکن اسکے زور پر اس قسم کا کوئی کلیہ بنانا حد درجہ نابالغیت کی دلیل ہے۔

ٹیگور اور اسکی شاعری کے متعلق یوں تو میرزا صاحب موصوف نے کتاب بھر میں رائے زنی کی ہے اور اسی نوع کی جیسکے وہ عادی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے اس سے سروکار رکھنا تضیع اوقات ہوگا مگر دو مقامات پر جو خامہ فرسائی ان کی جانب سے اس موضوع پر عمل میں آئی ہے وہ ایسی نہیں کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

صفحہ ۳۵ و ۵۵ پر رقمطراز ہیں

"ٹیگور کی شاعری تو پھر بھی حقیقت کی جھلک دکھاتی ہے، اسکی شہرت اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ وجدانی کیفیت رکھتی ہے" (ذرا اس جملہ کی ساخت ملاحظہ ہو) "انسان اس پیکر خاکی سے ساتھ ٹیگور کے منتہائے نظر تک پہونچ ہی نہیں سکتا"

اسکا خیال رہے کہ یہ سب میرزا یگانہ کی شاعری کے مقابلہ میں لکھا جا رہا ہے۔ جناب میرزا صاحب کی اس رقمطرازی کے متعلق میں کوئی تنقید کرنا نہیں چاہتا صرف چند اشعار میرزا یگانہ کے اور چند سطریں ٹیگور کی لکھے دیتا ہوں، ارباب ذوق ونظر خود اندازہ لگالیں گے کہ کس کی شاعری میں زیادہ حقیقت ہے۔ رہا یہ امر کہ ٹیگور کی شہرت مبالغہ سے خالی نہیں، اسکا جواب یہ ہے کہ آجکل شہرت نام ہی مبالغہ کا ہے، پھر ہر وہ شخص جو کسی کے مقابلہ میں بازی نہیں لے جا سکتا ہے جیتنے والے کے لئے یہی کہتا ہے کہ اس کی

خصوصیات کے بیان میں، اسکے محاسن کے تذکرہ میں، اصلیت کی جھلک کم ہے اور لوگ اس کی ستایش میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں، یہ انسانی فطرت ہے اور یگانہ ہوں یا شیرازی دونوں اس کمزوری سے مبرا نہیں ہو سکتے۔

یگانہ

اُلٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

گو شم از ذوقِ اسیری بر تنا بد مژدۂ
جان ایذا دوست دارد شوق زندانے دگر

ناخدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی دکھا
فکرِ ساحل چھوڑ لنگر ڈال دے منجدھار میں

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
صبا دا رنگ و بو اُڑ جائے پابندِ نظر ہو کر

سنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملک عدم کا جو کارواں نکلا

چاندنی کی سیر کرتے ہم سے آنکھیں مانگ کر
ہیں کدھر پروانۂ شمعِ شبستانِ بہار

ایسی بلا کہ ساقیا فکرِ نجات ہو کی
نشہ کہیں اُتر نہ جائے روزِ شمار دیکھ کر

ٹیگور

(۱) میرے مالک میری یہ دعا ہے کہ تو میری تنگ دلی کو قطعاً دور کر، مجھے رنج و راحت مساوی طور پر برداشت کرنے کی قوت عطا کر، مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں محبت کے ساتھ دوسروں کی خدمت کر دوں، مجھے یہ قوت دے کہ میں غریب آدمیوں کو اپنے سے علیحدہ نہ سمجھوں، اور مغرور اور طاقتور آدمیوں کے سامنے کبھی گردن نہ جھکا دوں۔ مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں روزمرہ کی تکالیف سے کبھی متاثر نہ ہوں، مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں اپنی طاقت تیری مرضی کے موافق محبت سے کام میں لاؤں" [گیتان جلی، مترجمہ رلے بیجناتھ صفحات ۱۷ و ۱۸]

(۲) وہ لوگ جو اس دنیا میں مجھ سے محبت کرتے ہیں مجھے قید رکھنے کی ہر طرح کوشش کرتے ہیں لیکن تیری محبت جو انکی محبت سے بدرجہا زیادہ ہے دوسری قسم کی ہے اور مجھے آزاد رکھتی ہے۔ اس خیال سے کہ میں کہیں انکو بھول نہ جاؤں وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑتے لیکن دن پر دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور تو نظر بھی نہیں آتا۔

میں تیرا نام نہیں لیتا ہوں، دل میں تیرا خیال نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن باوجود اسکے تیری محبت میری محبت کا انتظار کرتی رہتی ہے۔

(گیتان جلی، مترجمہ رلے بیجناتھ صہ ۱۹)

میں ٹیگور کے کلام سے مزید مثالیں پیش کر سکتا تھا مگر میرزا مراد بیگ (جن کو ان حالات سے باخبر

کرنا میرا اصل مقصد ہے) انگریزی شاعری سے کچھ زیادہ واقف نہیں معلوم ہوتے اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اب سوال درپیش ہوتا ہے کہ "اس پیکرِ خاکی کے ساتھ انسان ٹیگور کے منتہائے نظر تک پہونچ سکتا ہے یا نہیں" تو بندہ نواز میرزا امراد صاحب یہ تو فرمائیے کہ اس پیکرِ خاکی کے ساتھ کس شاعر کے منتہائے نظر تک پہونچنا ممکن ہے یگانہ کے منتہائے نظر تک؟ تو مذکورۂ بالا افکار یگانہ کو غور سے پڑھکر دیکھیے کہ انکے منتہائے نظر کا حصول تو اس مادی سفلی دنیا میں ممکن ہے نہ علوی اور روحانی میں۔ شاعر کا منتہائے نظر اکثر خیالی اور ناقابل رسائی ہوتا ہے اور عموماً ہر شاعر کا کچھ نہ کچھ کلام ایسے ہی منتہائے نظر کے فلسفہ کا حامل ہوتا ہے

صفحہ ۱۵۷ پر خامہ فرسا ہیں

"برخلاف اس کے ٹیگور کے ہاں (music of light) ایک بےمعنی استعارہ ہے۔

اس قسم کے بےمعنی استعاروں کی اس کے ہاں بھرمار ہے"

مجھے میرزا امراد بیگ معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ ان کی انگریزی کی قابلیت بہت ابتدائی معلوم ہوتی ہے اول تو میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ٹیگور کے یہاں بےمعنی استعارات کی بھرمار ہوتی ہے میرزا صاحب کو شاید استعارات زبان انگریزی کے سمجھنے میں اسی طرح دقت پیش آتی ہے جس طرح قدیم رنگ کے اُردو شعرا کو جدید شاعری کی نئی نئی اور اچھوتی تشبیہیں اور استعارات سمجھنے میں آپ اُن میں سے کسی سے پوچھ لیجیے کہ 'جلوؤں کی پریشانی' 'ردائے نور میں عریانی' 'نظر کی شعاعوں میں گم جانا' 'طشتِ گردوں میں شفق کا خونِ ناب ٹپکنا' 'بحرِ نیل میں سیم خام کی مچھلی' 'وغیرہ وغیرہ" کا کیا مطلب ہے اور وہ ان سب کو بےمعنی کہدے گا۔ بعینہ یہی حال ہمارے میرزا صاحب کا انگریزی میں معلوم ہوتا ہے، مہربان من میرزا صاحب یہ استعارہ نہ صرف یہ کہ مہمل نہیں ہے بلکہ شاعری کی دنیا میں اتنا مکمل استعارہ ہے کہ اس کی لذت صرف ذوقِ صحیح سے لبریز دلوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ آپ جو کچھ غلطی کر رہے ہیں وہ یہ کہ آپ کے نزدیک نور کی موسیقیت کوئی شے نہیں اور موسیقیت آواز سے جدا کوئی چیز نہیں کسی انگریزی لغت میں دیکھ لیجیے آپ کو music (موسیقی) کے معانی harmony کے بھی ملیں گے جسکے لیے صدا لازم نہیں، پھر music کا جرمن مرادف ہے mousika جسکے معنی ہیں ہنر (art) کے اب بھی اگر آپ کی سمجھ میں اس استعارہ کا مطلب نہ آئے تو بس اتنا سمجھ لیجیے کہ موسیقی سے نہ صرف انسان کا سامعہ متاثر ہوتا ہے بلکہ دماغ بھی، جسکے بعد نور کی موسیقی سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیئے۔

معذوری اگر مطلب من زود نیابی

میرزا صاحب موصوف کی اس دریدہ دہنی کی آخری مثال میں صفحہ ۱۲۰ سے پیش کرتا ہوں رقم فرماتے ہیں :-

"میرزا یگانہ خواجہ آتش کے فدائیوں میں ہیں اور غالب کے بھی بڑے معتقد تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے حریف، جو غالب کے مرتبہ سے قطعاً ناآشنا ہیں جھوٹ موٹ اسکی تعریفیں کیا کرتے ہیں اور خواہ مخواہ خواجہ آتش پر مُنہ آیا کرتے ہیں تو پھر مقامی ضرورتوں نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔"

اس عجیب استدلال کے کیا کہنے، ذوق سلیم سر دُھننے لگتا ہے، عقل معاملہ فہم حیران ہو جاتی ہے کہ یا اللہ یہ کونسی منطق ہے، کیا "مقامی ضرورتیں" کبھی بھی اس کو جائز کر سکتی ہے کہ ایک مسلم الثبوت استاد اور بے مثال شاعر کی جسکے کمالات کا تمام مشرق و مغرب معترف اور خود تنقیص کرنے والے صاحب بھی "بجائے خویش" معتقد ہیں، اس طرح تضحیک و تذلیل کی جائے جو کچھ منہ میں آ جائے علانیہ بُرا کہہ دیا جائے ہر ایک کی تخئیل اسکے کلام پر طعن کیے جائیں، جس دماغ کو اصول سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ یہ محسوس کرے گا کہ کسی کے معتقد کا حریف اگر اسکے معتقد الیہ کے مرتبہ سے ناشناس ہے اور اسکی جھوٹی تعریفیں کرتا ہے تو اس مرتبہ داں اور جائز اعتقاد رکھنے والے کو کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ حریف کے حسد میں معتقد الیہ کا بھی حریف بن جائے اور انسانیت کے دامن پر ہمیشہ کے لیے ایک بدنما داغ لگا دے

برین عقل و دانش بباید گریست

جس انسان میں ذرا سی بھی عقل ہوگی وہ اسکو خوب سمجھ لیگا کہ "خواجہ آتش پر کسی کا مُنہ آنا" غالب کے کمال پر خاک ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتا ہے، اس کی تابندگی کمال سے آنکھیں بند کر لینے کا کوئی استدلال نہیں ہوتا ہے۔

(۵)

پیشتر میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کا ہر مطالعہ کرنے والا باآسانی اس امر کا اندازہ کر لیگا کہ کتاب کی اشاعت کے تین مقصد ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اور اہم ترین مقصد ہے "میرزا یگانہ کی ستائش"۔ واقعی اور نفس الامری ستائش نہیں جائز اور واجبی ستائش نہیں، ایسی ستائش جسمیں شاعری کوٹ کوٹ کر بھر دیگئی ہو ایسی ستائش جسے دیکھکر انسان بے اختیار ہنس پڑے، جسے سنکر لامحالہ طبیعت کو تکدر ہو۔ ایک فرانسیسی فلسفی کا قول ہے "بالکل بُرا دنیا میں کوئی شخص نہیں" بالفاظ دیگر ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صفت

ضرور ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ماتحت ہر شخص کی تھوڑی بہت تعریف، کم و بیش ستائش، ضرور کی جا سکتی ہے، سچی، صحیح، اور اعتدال سے مطلق غیر متجاوز تعریف کرنے والے تو آج دنیا میں بہت کم ہیں، جو شخص بھی کسی دوسرے کی تعریف کرتا ہے وہ تھوڑے بہت غلو سے ضرور کام لیتا ہے، بالکل یہی حال تنقیص کا ہے۔ غرض تعریف ہو یا تنقیص، بیان حد اعتدال سے کچھ نہ کچھ متجاوز ہو ہی جاتا ہے، لیکن اس تجاوز، اس مبالغہ کی ایک حد ہوتی ہے، جسکے بعد تعریف ہو یا تنقیص محض خوشامد یا بد نفسی رہ جاتی ہے، جو ہر طبیعت پر گراں گزریگی — آیات وجدانی میں میرزا یگانہ کی جو تعریف کی گئی ہے، جس ستائش کے مستحق وہ قرار دیے گئے ہیں وہ نہ صرف حد اعتدال سے متجاوز اور غلو سے پُر ہے بلکہ اس درجہ خلاف واقعہ اور غیر مہذب ہے کہ دیکھنے والا تکدر اور تنغص کے علاوہ اپنے دل میں نفرت کا احساس لے کر اُٹھتا ہے

اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

قبل اسکے کہ میں اپنے اس بیان کی تائید میں کتاب سے نمونے پیش کروں اور اُن سے بحث کیجائے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں میرزا یگانہ کے کلام کا واجبی حد تک معترف بھی ہوں۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد کے ۱۹۲۷ء والے مشاعرہ میں مجھے ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کا بھی موقعہ مل چکا ہے، اور آیاتِ وجدانی کے مطالعہ سے پیشتر میں نے انکا مختصر سا دیوان "نشترِ یاس" بھی توجہ سے پڑھا ہے، اور میں اسکا مقر ہوں کہ مجھے نہ صرف عمدہ اور دلکش اشعار اس میں ملے بلکہ میں نے میرزا یگانہ کے اشعار میں اکثر وہ معنویت بھی پائی جو دورِ حاضرہ کے چند شعرا کے کلام سے مفقود ہے، آیاتِ وجدانی میں بھی جو غزلیں اور اشعار میرزا یگانہ کے مرقوم ہیں اُن میں سے اکثر غزلیں مرصع اور بعض اشعار بلند پایہ اور استادانہ ہیں اور کتاب کے اس حصہ سے یہ بھی ٹپکتا ہے کہ انھیں زبان پر خاصہ عبور ہے۔ اُنکے اشعار میں انقلاب انگیزی کا حسن بھی موجود ہے گو بدرجۂ اتم نہیں اور طنزیات میں بھی انھیں ایک حد تک مہارت ہے۔ مجھ میں عادت ہے کہ جو شعر اچھا دیکھتا ہوں یاد کر لیتا ہوں، میرزا یگانہ کے اکثر اشعار مجھے حفظ ہیں اور اُن کی بابت میرے اعتراف کمال کے جذبہ کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

(۱) ہر رات ہوئی صبح کو اک خواب فراموش — دُنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہیگی

مذکورہ بالا شعر پہ روح وجد کرتی ہے

(۲) عشق کا حسن طلب اک معنی بے لفظ ہے — ملتفت بندہ جائیگی مطلب ادا ہو جائیگا

اس شعر کا میں اس قدر قدر دان ہوں کہ کسی استاد کی ہم طرح غزل میں رکھنے کو تیار ہوں۔ لیکن بس،

یہاں میرے اعتراف کی انتہا ہے، اس سے زیادہ بڑھنے کو میں تیار نہیں، میں یہ کہنے پر آمادہ نہیں، کہ میرزا یگانہ، غالب، ٹیگور، شبلی، اور ہومر سے بہتر شاعر ہیں، میں یہ ماننے پر راضی نہیں کہ میرزا یگانہ حافظ، سعدی، نظیری پر فوقیت رکھتے ہیں، میں یہ قبول کرنے پر تیار نہیں کہ میرزا یگانہ میر و اقبال سے برتر ہیں، ممکن ہے کہ میرا اعتراف اصلیت سے کچھ کم ہو لیکن اگر کم ہے تو وہ کمی اتنی نہیں جتنی میرزا امراد بیگ کے اعتراف میں زیادتی ہے۔

کتاب کے شروع میں میرزا یگانہ کی تصویر ہے، تصویر کے اوپر لکھا ہے،

A man who knows himself [ایک خود شناس شخص]

تصویر کے نیچے لکھا ہے

A living mind of the East [مشرق کا ایک زندہ جاوید شاعر]

کتاب میرزا یگانہ کی تصنیف ہے اور گو میرزا امراد بیگ محاضرات اور دیباچہ کی حد تک ذمہ دار ہیں لیکن اصل ذمہ داری تمامتر میرزا یگانہ ہی کے سر ہے۔ میرزا امراد دیباچہ میں لاکھ لکھیں کہ خود ستائی ایک تبلیغی فرض ہے، میرزا یگانہ ابتدا میں کتنا ہی چیخیں کہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے — آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے (یگانہ)

لیکن کوئی عقلمند اور سمجھدار آدمی ایسا نہ نکلے گا جو میرزا یگانہ کے اس فعل کو سراہے کہ وہ خود اپنی تصویر کے متعلق وہ الفاظ لکھیں جو اس کتاب میں لکھے گئے ہیں کیا ان جملوں میں نازیبا اور ناجائز تعلی نہیں ہے کیا ان الفاظ سے بے معنی اور بیگانہ حقیقت خود ستائی کی بو نہیں آتی ہے۔

انسانی فطرت ہے اور اس کی مطابقت میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اُسکے ہیرو سے زیادہ لائق و فائق، اسکے ہیرو سے بڑھ کر عالم و فاضل، اسکے ہیرو سے زیادہ ذہین و ذکی دنیا میں کوئی نہیں ہے کہ جس صنف علم سے وہ تعلق رکھتا ہے اُس صنف میں اسکا کوئی ہم عصر اس سے برتر نہیں ہے، اُس کا یہ عقیدہ خواہ غلط ہو یا صحیح، خواہ درست ہو یا نادرست، زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کا مدعی ہو کہ ابتداء آفرینش سے آج تک اس مخصوص شعبۂ علم و کمال میں اس کے ہیرو جیسا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا، حالانکہ وہ ہیرو موجودہ تمام معاصرین ہی پر فوقیت پانے کا مستحق نہ ہو تو جو شخص سنے گا اُس کو ناگواری ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے مجھکو میرزا اسے شیرازی سے شکایت ہے کہ انھوں نے بغیر کسی سوچ بچار کے، بلا کسی نسبت و تناسب کے، اندھا دھند، آنکھ بند کر کے، اگلوں پچھلوں، متقدمین و متاخرین، عرب و عجم، یورپ و ایشیا، سب پر میرزا یگانہ کو

ترجیح دیدی - ایسی تعریف کی جسکی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا؛ اتنی ستائش کی جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام - وہ خوشنما کی جسکا سر ہے نہ پیر، وہ تحسین و آفریں کی جسکی نہ حاجت ہے نہ اہلیت، اور الٰہیات کے دفاتر اس میں بیکار کردیے، تاج محل کی صنعت کو اس میں نگاہوں سے گرادیا، نبوت کی سرحدوں سے اس میں ڈانڈا ملا دیا، عقل و سمجھ کے حدود اس میں باطل کردیے

فریاد از تطاول شکیں کمندِ تو

صفحہ ۳۷ سطر ۱

"دردمندانہ جذبات کی ایسی تصویر کھینچی ہے جو کسی مرقعِ سخن میں نہ ملیگی"

ذرا کسی "مرقعِ سخن" کے ٹکڑے پر غور کیجیے، یعنی میرزا یگانہ کے شعر کا جواب نہ مشرقی ادب میں ملیگا نہ مغربی لٹریچر میں، نہ ماضی کے شعرا کے یہاں دکھائی دیگا نہ حال کے سخنوروں کے کلام میں - اور یہ سب کس شعر کیلیے

منکہ بر لبِ تابم درد زیستن تنہا   صبحدم چساں بینم شمعِ انجمن تنہا

میرزا مراد مدعی ہیں کہ شمع کی بیکسی کا خاکہ کھینچنے میں ایسا شعر کسی اور شاعر کے قلم سے نہیں نکلا، مہربان من میرزا صاحب، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی تو دور ہیں ان میں تو لاکھوں اس سے بہتر نمونے ملیں گے - اردو کے دو شعر اس شاعر کے ملاحظہ فرمایئے جس کی تضحیک و تذلیل میں آپ کو اسقدر غلو ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم   ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

صفحہ ۴۲ سطر ۱۶ "اسکے سامنے فلسفۂ الٰہیات کا سارا دفتر باطل نظر آتا ہے" -

مندرجۂ بالا بیان حسب ذیل شعر کے متعلق ہے

ذوق میتواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ   ہست شاہد عادل بوے پیرہن تنہا

شعر کی اچھائی میں کوئی شبہہ نہیں، لیکن اس سے یہ استنباط کہ فلسفۂ الٰہیات باطل نظر آتا ہے کسقدر پوچ ہے - داغ کا شعر ہے

کیونکر اس کی نگہِ ناز سے جینا ہوگا   زہر دے اُسپہ یہ تاکید کہ جینا ہوگا

میں اس کی تعریف میں کہوں کہ اس کے سامنے مسئلہ قضا و قدر کی تمام توضیحات لغو ہیں، یا اسکے مقابلہ میں جبر و اختیار کے تمام اسرار فضول ہیں تو آخر کس حد تک بجا ہوگا - شعر اچھا ہے اور بہت اچھا - اپنی جگہ پر میرزا یگانہ کے شعر سے بدرجہا بلند ہے، لیکن اسکے لیے یہ کہنا کہ قدرت کے دفاتر باطل نظر آتے ہیں

منطق و فلسفہ گنگ ہو جاتے ہیں، غالب، بیدل، فیضی، عرفی، نظامی، خسرو، کسی کے یہاں اسکے مقابلے کا شعر نہ نکلے گا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

صفحہ ۴۲ سطر ۹۔

"مگر اس شعر میں مصنف کے زورِ بیان نے وہ دلآ ویزی پیدا کر دی ہے کہ اگلے اساتذہ کے بیشتر اشعار سامنے لائے جائیں تو بھی یہ شعر اپنے منھ سے آپ بولتا نظر آئے گا"

طرزِ بیان کو جانے دیجیے، سیدھی سادی زبان میں اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگلے اساتذہ کے بیشتر حصہ کلام پر میرزا یگانہ کے شعر کو فوقیت حاصل ہے۔ شعر یہ ہے:۔

طرفہ محشر سے دارد از فریب فردائے زندہ زیر پیراہن مُردہ در کفن تنہا

میں نہایت ادب سے میرزا یگانہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فارسی سے قطع نظر کرکے صرف اُردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائیں تو بہتر ہوگا، وہ لاکھ بلند پروازی کریں، ہزار اُن کا مرغِ تخیل سدرہ و طوبیٰ کی خبر لائے، مگر اُنکی فارسی سے نہ صرف "ہندی کچھڑی" کی بو آتی ہے، بلکہ وہ شگفتگی اور معنویت بھی اس میں موجود نہیں ہے جو چند اور ہندی اساتذہ کے فارسی کلام میں پائی جاتی ہے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ہندی شعرائے فارسی اور فارسی شعرا کے کلام میں ہمیشہ تمیز کی جا سکتی ہے۔ اول الذکر کے کلام میں عموماً وہ شیرینی اور بلاغت نہیں ہوتی جو آخر الذکر کے یہاں کم و بیش کلام کا جزوِ لاینفک ہوتی ہے مگر بعض ہندی شعرائے فارسی نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنے فارسی کلام میں بڑی حد تک اُن خصوصیات کو داخل کر لیا ہے جو عموماً اہلِ فارس کے کلام کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے شعرا کی ایک زندہ مثال ڈاکٹر اقبال ہیں۔ میرزا یگانہ کے فارسی کلام میں جو خشکی اور خشونت ہے وہ ابتدا ہی میں فارسی داں کو اس قدر گراں گزرتی ہے کہ وہ ان کے اشعار کے معانی پر غور کرنے سے بیشتر یہ تصفیہ کر لیتا ہے کہ ان کا فارسی شاعری سے باز رہنا ہی بہتر ہے۔ مندرجہ بالا شعر ہی میں دیکھیے عبارت کی کرختگی کس قدر نمایاں ہے۔ میرزا مراد بیگ نے اسی کتاب میں کسی جگہ غالب کے ایک شعر کے متعلق لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے الفاظ جنگل سے لاکر کٹہرے میں بند کر دیے گئے ہیں" اس اعتراض کا جواب میں انشاءاللہ موقعہ پر دوں گا، فی الحال عرض کرنا یہ ہے کہ کیا یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر میں الفاظ جنگل سے پکڑ لائے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ کیا ان میں وہ بے ڈھنگا پن نہیں ہے وہ حیوانیت نہیں ہے جو جنگلی درندوں میں پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۶۲ سطر ۹۔ "اس تخیل اس بیان کی مثال، اُردو کیا فارسی لٹریچر میں بھی نہیں

ل سکتی ۔"

سطر ۱۲ "الفاظ کے انتخاب پر غور کرو تو تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جائے۔"

جس شعر کی تعریف کے یہ پُل باندھے گئے ہیں ذرا وہ بھی سُن لیجیے

جواب کیا وہی آواز بازگشت آئی   قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

آپ نے دیکھا میرزا امراد نے اس شعر کی تعریف میں کیا زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں انکے نزدیک اساتذہ کے دواوین عالم تنہائی و بیکسی کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں مگر اس شعر کا جواب ان میں نہ ملیگا۔ ان کا مطالعہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس شعر کی ٹکر کا شعر کسی اُردو کلیات میں نہیں ہے۔ ان کی نظر میں اس شعر میں الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جاتی ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ میرزا یگانہ کے وجود سے برسوں بیشتر اُردو کے دو غیر فانی سخنوروں نے بیکسی و تنہائی کے اس سے بہتر مضامین اس سے زیادہ موثر پیرایہ میں ادا کیے ہیں

(۱) اسیر ایسی کہاں قسمت کہ پہونچوں اُڑ کے پھولوں تک   کبھی جا کے قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو (امیر مینائی)

(۲) ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے (غالب)

میرزا امراد بیگ کی وسعتِ مطالعہ کی اصلیت کا جگہ جگہ اندازہ ہوتا جاتا ہے۔

صفحہ ۶۹ سطر ۱۴ ۔ "اسکا جواب میر و غالب تو کیا، عرفی و نظیری کے ہاں بھی ڈھونڈے سے نہ ملیگا۔"

معاذ اللہ اس جہل مرکب کی کوئی حد ہے ۔ عرفی، نظیری، میر، غالب سب کے مجموعہ کلام کی کتنی بڑی تنقیص ہے اور بلا دلیل۔ شعر زیر بحث کو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر   کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستا نہ ملا

بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا امراد کی سخن فہمی کی حقیقت ہر ہر قدم پر واضح ہوتی جا رہی ہے۔

صفحہ ۷۶، سطر ۱۲۔ "کیا غالب، ٹیگور، براؤننگ اور شیلی کے کلام سے اسکا جواب پیش کیا جا سکتا ہے"

وہ شعر جسکی تعریف میں ان مسلم الثبوت اساتذہ کی اتنی آسانی کے ساتھ تنقیص کی گئی ہے حسب ذیل ہے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے   وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تعریف و تحسین کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ مخصوص اور مشہور شعرائے دہر کا نام لیکر ان کے کلام پر حرف گیری کی جائے۔

صفحہ ۹۷ -"

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا — خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

اس شعر کی تعریف میں حضرت علی مرتضیٰ کے مشہور قول "اجلک حافظک" کی ترجمانی ہو میرزا امراد نے یہ کہہ یا کہ "ترجمہ کی اس سے بہتر مثال اردو میں مفقود ہے" معلوم ہوتا ہے انھوں نے نظم طباطبائی مرحوم کی نظم گور غریباں اور نادر کاکوروی مرحوم کی نظم "یادِ ایام گزشتہ" کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اگر انصاف پسند ہیں تو کبھی ایسی بات نہ کہتے - سچ تو یہ ہے کہ اس شعر میں میرزا یگانہ نے جدت تخیل کی کوئی مثال نہیں دی - اسی مضمون کو فارسی اور اردو کے مختلف اساتذہ مقدد بار اور مختلف پہلوؤں سے بہت پیشتر کہہ چکے ہیں اور بعض کا انداز بیان میرزا یگانہ سے یقیناً بہتر ہے :-

(۱) بڑے نادان ہیں جو لوگ ڈرتے ہیں آمیر اس سے — اجل تو نام ہے اک زندگانی کے نگہبان کا (امیر مینائی)

(۲) امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک — نہ اک مو سے بدن کم تھا نہ اک تار کفن گم تھا (آتش لکھنوی)

صفحہ ۱۰۲

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کاروان اپنا (یگانہ)

اس شعر کی ستایش میں ارشاد ہوتا ہے "دنیا کے وسیع لٹریچر میں شاید ہی کوئی نمونہ میرزا صاحب کے اس شعر پر فوق لیجا سکے" میرزا امراد نے شاید ٹینیسن Tenny son کی مشہور نظم Crossing the bar اور براؤننگ کی نظم "ربی بن عزرا" کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اتنا مہمل دعویٰ زبان سے نہ نکالتے -

صفحہ ۱۲۱ -

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا — مٹ کے بھی اک پیکر نشو و نما ہو جائے گا (یگانہ)

اسکی تعریف یوں کی جاتی ہے

"میر، سودا، درد، غالب، ذوق، مومن اور جملہ اساتذہ اور شعرا کے دواوین پڑھ جائیے مگر اس معنیٔ یگانہ کا سہرا مرزا آس ہی کے سر رہے گا"

تعجب ہے کہ میرزا امراد کو اردو ادب میں اس مضمون کے اشعار نہ ملے - انکے استفادہ کے لیے میں ایک شعر لکھتا ہوں، زیادہ خلش ہو تو نئے پرانے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کریں - یوں ہی بغیر پڑھے لکھے کوئی لا طائل دعوے زبان سے نہ نکالیں -

(۱) بعد مردن بھی مری گردش قسمت نہ گئی — خاک ہو کر بھی بگولا ہوں بیابانوں میں

یہ تخئیل اس قدر کہنہ ہے کہ کسی موجودہ شاعر کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی ایجاد کا سہرا اس کے سر ہے سراسر جہالت اور ناواقفیت کی دلیل ہے

پہلے اپنی قابلیت آزمانا چاہیے　　　پھر کہیں غالب کے منہ لے پاس آنا چاہیے

صفحہ ۱۲۳

عشق کا حسنِ طلب اک معنیِ بے لفظ ہے　　　ٹکٹکی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائے گا (یگانہ)

اس کی ستایش کا طرز دیکھیے

"اگر اساتذۂ عجم میں سے کسی کے ہاں اس شعر سے لڑتا بھڑتا کوئی شعر نکل آئے تو بڑی بات ہے"

صفحہ ۱۲۶:

تماشا ہے مری تصویر کا ہکا بکا رہ جانا　　　قلم کے زخم کھا کر پیکرِ خونبار رہ جانا

"اس رنگینیِ تخئیل کی مثال لکھنؤ کا سارا لٹریچر ایک طرف رکھا جائے تو بھی پیش نہیں کرسکتا"

اس جملے میں جو سقم ہے وہ جانے دیجیے ذرا اس اندھا دھند تعریف کو تو دیکھیے پھر "تماشا یہ ہے" کہ "لکھنؤ کے تمام لٹریچر" میں خواجہ آتش کا کلام بھی شامل ہے جسکے بزعم خود میرزا یگانہ اور میرزا مراد دونوں اس قدر قدر دان ہیں۔ رہا یہ شعر، مجھے تو اس میں نہ کوئی جدت معلوم ہوتی ہے نہ بلندیِ تخئیل، بلکہ اصل میں اس میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ اصلیت سے اتنا دور ہے کہ کسی کو کبھی پسند نہیں آسکتا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس وقت میرزا صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دینا پڑ رہا ہے مگر وہ خود آیات وجدانی میں فرما چکے ہیں کہ "اینٹ کی لینی اور پتھر کی دینی کا زمانہ ہے" میری رائے میں، تو لکھنؤ کا بُرے سے بُرا شعر بھی میرزا یگانہ کے اس شعر سے اچھا ہے۔

صفحہ ۱۵۰

"پیدا اٹھا ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی　　　دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر" (یگانہ)

"اردو اور فارسی کا ادب، تو کیا دنیا کا کوئی لٹریچر اس شعر کا جواب شاید ہی پیدا کرسکے"

اور لطف یہ ہے کہ اس قدر پامال مضمون، اتنی بدمذاقی سے باندھا ہوا، شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملے۔ اسی زمین میں غالب نے رفتار کا قافیہ ایسا نظم کیا ہے کہ یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق　　　لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (غالب)

صفحہ ۱۶۸- رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں　　　اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر

"میر تقی میر کا سارا دیوان اُلٹ جاؤ اس درد انگیز صدا کا جواب نہ پاؤ گے"

الامان! میرزا صاحب میر کے دیوان میں تو ہزاروں اس سے زیادہ دلدوز تیر ہیں، لاکھوں اس سے بڑھ کر کلیجہ چھیدنے والے ناوک ہیں۔ میر کے منکسر المزاج معتقدین میر پر جان نثار کرنے والوں کے اشعار میں میرزا یگانہ کے اس شعر سے زیادہ درد ہے اس شعر سے زیادہ اثر ہے۔ آپ کو تنبیہ کرنے کی غرض سے میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں

(۱) اے جرس تو تو نہیں قافلہ والوں سے جدا — تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا (امیر مینائی)

(۲) اجل اس گلی سے ہو کر مرے گھر تک آئے — دم واپسیں سے شاید مجھے بوئے یار آئے (تسلیم لکھنوی)

صفحہ ۱۷۴

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر — عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

"یہ غزل بیسویں صدی کا ماسٹرپیس ہے۔ خواجہ وزیر کے مطلع اور اس مطلع میں زمین آسمان کا فرق ہے"

وزیر کا مطلع ہے:

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کو نہ تغزل سے لگاؤ ہے نہ ذوقِ سلیم سے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنی بد ذوقی کے الفاظ نہ لکھتے، وزیر کے مطلع کی شادابی کے سامنے یگانہ کے مطلع کی کرختگی صاف ظاہر ہے۔

صفحہ ۱۸۹

اُف رے تصرفاتِ عشق آگ لگے دھواں نہ ہو — ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذتِ سوز و ساز میں

"ایسی الہامی زبان پر غالب تو کیا میر کا دسترس مشکل سے ہو سکتا تھا"

واللہ، کیا تعریف ہے اور کتنی صحیح زبان میں! میرزا صاحب کو اس مغالطہ دہی میں شرم بھی نہ آئی، خدا کی شان میرزا مراد بیگ، غالب اور میر کی زبان دانی پر اعتراض کریں، وہ جنھیں خود اردو کے چند صحیح جملے لکھنا نہیں آتے اساتذہ پر حرف گیری کریں، پھر آخر اس شعر میں خوبی کیا ہے۔ اول تو اس کا مطلب بھی واضح نہیں ہوتا، دوسرے شعر کچھ ایسا گنجلک اور پھیکا سا ہے کہ کسی مذاق کے شخص کو اس میں لطف نہیں مل سکتا۔

اس شعر کی تعریف میں دو اور ارشادات حسب ذیل ہیں:—

صفحہ ۱۹۱۔ "اے حکیم فرزانہ، تیری فکرِ رسا عام سطح سے بلند ہو کر اپنے اصلی کما نشانے کا سراغ

لگ ڈی تو تیری قلمرو کا ڈانڈا نبوت کی سرحد سے مل جائے"

صفحہ ۱۹۲ " تو ان سے اعراض کر اور پیغمبرانہ اولوالعزمیوں سے کام لے کر بارگاہ احدیت میں عرض کر"

نعوذ باللہ من ذالک۔ میرزا صاحب نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ "میرزا یگانہ پیغمبر ہیں اور خدا کا قرآنی ارشاد کہ رسول اکرمؐ پیغمبر آخرالزماں تھے غلط ہے" ڈاکٹر بجنوری نے تو دیوان غالب کو الہامی اور آسمانی صحیفے سے نسبت دی تھی، میرزا مراد نے یگانہ کو پیغمبر بنا ہی دیا۔

صفحہ ۱۹۵

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں معنیٔ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

"کیا شیخ سعدی کا شعر بھی فی الحقیقت اسی مرتبہ پر فائز ہے"

لیجیے شیخ علیہ الرحمہ بھی لپیٹ میں آ گئے۔ اُن کا شعر ہے

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

بھلا اس شعر کی رنگینی اور معنویت کی گرد کو بھی یگانہ کا شعر پہنچتا ہے، کیا صرف "معنیٔ بے لفظ" کا ٹکڑا رکھ دینے سے شعر میں تمام حُسن پیدا ہو گئے۔ سعدی کے شعر کی سی شیرینی اور بلاغت کیا یگانہ کے خشک شعر میں کہیں بھی ہے۔

اس موقعہ پر یہ اعتراض کرنا بیجا نہ ہو گا کہ یگانہ کے کلام میں چند مخصوص ٹکڑے بہت استعمال ہوتے ہیں جس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انکی قوت ابداع بہت محدود ہے

معنیٔ بے لفظ، صدائے بازگشت، منزل ناموس، بازیچۂ شام وسحر، طلسم بندی نقش نگار وغیرہ۔

صفحہ ۱۹۷

عمر گھٹنے کے لیے ہے وقت کٹنے کے لیے مفت دن گنے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

"میر و غالب تو کیا عرفی و نظیری نے بھی ایسا فلسفہ نہ بیان کیا ہو گا"

مرزا صاحب سچ فرماتے ہیں، غالب اور عرفی وغیرہ اس قسم کا شعر کہنا اپنی ذلت سمجھتے تھے۔

صفحہ ۲۵۷

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر ڈوب کے دیکھے تو یگانہ ساحل ہو جائے

"مذہب کے فلسفے کو اس قادرالکلامی سے آج تک کسی نے نہیں بیان کیا"

گویا مرزا صاحب نے تمام عالم کے، اگلے پچھلے شاعروں کا کلام، صوفیوں کے اقوال، مبلغوں کے

خطبے، فلسفیوں کے مقالے، سائنسدانوں کے مکالمے، سیاست دانوں کی تقریریں دیکھی اور پڑھی ہی تو ہیں جو اس بے دردی اور اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ "آج تک کسی نے نہیں بیان کیا" اور لطف یہ ہے کہ خود اس شعر کا مطلب نہیں سمجھے ہیں، فرماتے ہیں کہ "ملا جو رسمیاتِ بیہودہ کی اشاعت کرتے ہیں ذرا ڈوب کر تو دیکھیں کہ کتنے پانی میں ہیں" واہ کیا سخن فہمی ہے۔ "وائے بر جانِ سخن" افسوس ہے کہ میرزا صاحب اس صاف شعر کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ فلسفہ شناس صاحب، اس شعر میں نہ مذہب کا فلسفہ ہے نہ مذہب کے پیروؤں کا، یہ شعر تصوف سے متعلق ہے ذرا غور و فکر سے کام لیجیے، مطلب واضح ہو جائے گا۔

(۶)

آیاتِ وجدانی کا دوسرا مقصد جو پہلے مقصد سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے غالب کی تعریض و تنقیص رہی ہے — اندھا دھند بے سوچے سمجھے، بے موقع و محل بار بار — ہر چار سطروں کے بعد یگانہ اور غالب کا موازنہ ہے، ہر ہر صفحہ پر یگانہ اور غالب کا تقابل ہے، ہر شعر کی تفسیر کے آخر میں میرزا مراد بیگ شیرازی نے یہی راگ الاپا ہے کہ میرزا یگانہ کو غالب پر فوقیت ہے۔ دیکھنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کتاب یگانہ کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے یا غالب کی تنقیص میں۔ اس میں یگانہ کی عظمت کے راگ گائے گئے ہیں یا غالب کی ناقابلیت کا رونا رویا گیا ہے، مگر میرزا صاحب کو اس کا کوئی احساس اور خیال نہیں۔ وہ خوشامد خصلتی کی طوفانی رَو میں اور حسدِ پیشگی کی مجنونانہ دُھن میں ہوش و خرد بالکل کھو بیٹھے۔ ان کو بس ایک سبق یاد ہے کہ غالب، مومن، میر و سودا، عرفی و نظیری، حافظ و سعدی، ٹیگور و ملٹن، غرضیکہ عالمِ سفلی و علوی کے جملہ اہلِ کمال پر یگانہ کو افضلیت و فوقیت ہے۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بیگانگی جو اس کا دنیا پر کیا اثر پڑے گا، اس مذبوحیت سے لوگ کیا نتیجہ اخذ کریں گے، اس گھبراہٹ کے اظہار سے دنیا کیا سمجھے گی؟ آیا جو ان کا مطلب ہے، جس مطمحِ نظر کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جس چیز کو وہ باور کرانا چاہتے ہیں، وہی ہوتا ہے یا اس کے بالکل برعکس، اُسکا بالکل اُلٹا، اُس کے بالکل مخالف۔ وہ ہر سطر میں لکھتے ہیں کہ "غالب شاعر نہ تھا"۔ دیکھنے والا سوچتا ہے "وہ شاعر نہ تھا تو یگانہ کا اُس سے مقابلہ چہ معنی دارد"۔ وہ ہر ورق پر دوہراتے ہیں "غالب زباندان نہیں تھا"۔ ناظر خیال کرتا ہے وہ زبان دان نہ تھا تو اسکے مقابلہ میں یگانہ کی زباندانی کا علم گاڑنے کی کوشش کرنا اس کا مطلب؟" وہ ہر ہر شعر پہ چیختے ہیں "غالب نے کبھی اس پایہ کا شعر نہیں کہا" شعر کو جانچنے والا غور کرتا ہے "اس نے کبھی اس پایہ کے

اشعار نہیں کہے تو یگانہ کے اشعار کے ساتھ اس کے اشعار کے ذکر کا کیا مقصد ہے۔ غالب بُرا تھا، نالایق تھا، جاہل تھا، بے عقل تھا، لاکھ سہی۔ غالب شاعر نہ تھا، جدت طراز نہ تھا، اہل زبان نہ تھا، صاحب ذوق صحیح نہ تھا، ہزار سہی۔ مگر متواتر یگانہ کا اس سے مقابلہ، بار بار یگانہ کا اس سے موازنہ، جگہ جگہ یگانہ کے اشعار کو اس پر ترجیح، قدم قدم پر یگانہ کی تخئیل کو اس کی تخئیل پر فوقیت" اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بےشک ہے اور بلاشبہ ہے، وہ کیا ہے ابھی اس سے بحث نہیں، لیکن میرزا صاحب نے خود اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارلی، خود اپنی تلوار سے اپنے اوپر وار کیا، اپنی بوکھلاہٹ سے اپنے اغراض کا قلع قمع کردیا، اپنی گھبراہٹ سے اپنے مقاصد پر پانی پھیر لیا۔ چلے تھے غالب کی وقعت کم کرنے، بجائے اسکے اُسکی قدر بڑھادی، روانہ ہوئے تھے یگانہ کا رتبہ بلند کرنے، اسکے بدلے انکی توقیر گھٹادی۔ حقیقت میں میرزا مراد کی بیکسی اور کس مپرسی یہاں پر بڑی مضحکہ خیز ہے ؎

کرنے کیا آئے تھے اور کیا کر چلے۔

لائق، مشہور، اور باعظمت آدمی کو حاسدوں اور دشمنوں کی کمی نہیں ہوتی پہلے اسے اپنے سے نسبتاً کمتر آدمیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا جنکی اُمیدیں جنکی کامیابیاں اسکے سبب سے بارآور نہیں ہو سکتیں جنھیں وہ ہر شعبہ اور ہر مقابلہ میں شکست دیتا ہے۔ بعد ازاں اسے ان غیر معروف اور غیر مشہور، خفیف اور کمظرف، دنیوی جراثیم کے خلاف مدافعت کرنا پڑتی ہے جو دامن انسانیت پر داغ ہوتے ہیں، جو ہمہ قسم کی ذہانت و ذکاوت، ہر نوع کی جدت و قابلیت، سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جن کی جانب سے کوئی ایسا فعل عمل میں نہیں آتا جو ملک کو فائدہ پہونچا سکے یا قوم کے لیے مفید ہو سکے جن میں نہ اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ خود کوئی نفع بخش خلائق، سود مند عوام فعل کریں، نہ اس کی استعداد ہوتی ہے کہ اپنے سے برتر دماغ، اپنے سے بہتر ذہانت و قابلیت کے اشخاص کے احکام پر، اپنے سے بلند ذکاوت افراد کے نقوش قدم پر عمل پیرا ہوں۔ اس طبقے کے اصحاب کو اپنی بے بضاعتی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اور اس احساس پر وہ نہ صرف دل ہی دل میں جل بھن کر خاک ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی کم آلودہ ذہنیت کا زہر اُس پر اُگلتے ہیں جو صحیح معنوں میں قابل اور مشہور ہے، جو حقیقی طور پر باعظمت اور لائق ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ صرف اپنی ذلیل فطرت کے احساسات، اپنی کمینی طبیعت کے الہامات کی تعمیل کرتے ہیں، اپنے کمزور ترد کے جذبات کی تکمیل کرتے ہیں۔ دوسرے کی عظمت ان کی ذاتی خودداری

کو صدمہ پہونچاتی ہے اور وہ نہایت آسانی سے حاسد اور غیبت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر عوام کی نگاہ میں وہ اپنے محسود کی عظمت، پبلک کی نظر میں اپنے معتوب کی رفعت گھٹا سکے تو وہ اپنے اور اُسکے ابین خلیج کو تنگ تر کر دیں گے۔ یہ لوگ مشاق گو، بے اعتبار افترا پرداز ہوتے ہیں، اور اسی افترا پردازی کو اپنی کامیابی کا واحد آلہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی علمیت، اپنی ذاتی اہمیت، اپنی طبعی جاہلیت کے غلط اور من گڑھت افسانوں کی اشاعت کرتے ہیں اور اس طرح بظاہر خود کو تسلی دے لیتے ہیں، اپنے کو ایک خیالی ارتفاع پر کھڑا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے محسود کے متعلق نہایت دریدہ دہنی سے، نہایت صفائی سے، دروغگوئی کرتے ہیں، اُسکے کمالات کی تذلیل کرتے ہیں، اُسکے خانگی اور ذاتی حالات کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اُنھیں دریافت کرکے اُن کی آڑ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، اور اس طرح بادی النظر میں وہ خود کو تسکین دے لیتے ہیں، اپنی شہرت کو بلند تر تصور کر لیتے ہیں۔

مذکورۂ بالا نشانیوں سے اس قسم کے اشخاص کو ہر انسان پہچان سکتا ہے کیونکہ ہر ناکارہ انسان دو نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے، اُس کی نہ چھُپنے والی شیخی، اور اُس کی لا تنا ہی غلط بیانی جو در اصل اسکے اظہار شیخی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی غلط بیانی چونکہ اُس کی کمزور ذہنیت کا آئینہ ہوتی ہے اس لیے اس سے وہی لوگ دھوکا کھاتے ہیں جو اسکے ہم مذاق اور ہم مشرب ہوتے ہیں۔

کبوتر با کبوتر باز با باز

بعینہٖ یہی حال میرزا یگانہ کا ہے اور ان کی خوشامد میں میرزا مراد بیگ شیرازی کا، ان لوگوں نے دیکھا کہ غالب اپنے انتخاب شاعرانہ خیالات، اپنے نادر تخیلات، اپنے نایاب انداز بیان کی وجہ سے اردو کے تمام شعراء پر غالب ہے، اس کا فلسفہ، اسکی حقائق آفرینی، اسکی نکتہ سنجی، اسکی وسیع النظری، اس کا طرز ادا، اُردو کے کسی اور شاعر کا چراغ اسکے سامنے جلنے نہیں دیتے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کے پاس وہ شاعرانہ دماغ نہیں جو شاعر کو اصلی معنوں میں شاعر بناتا ہے، وہ وجدانِ سلیم نہیں جو انسان کو حقیقی طور پر رموزِ فطرت سے واقف کرتا ہے، وہ قوتِ ابداع نہیں جو انھیں غالب تو درکنار، اور دوسرے اُردو اساتذہ کا مدمقابل بنا سکے، لہذا اُنھوں نے سوچا کہ لاؤ اسکے پیچھے پڑ جاؤ اسکو بُرا بھلا کہنا شروع کر دو، اسکی شاعری کی تنقیص کرو، اسکے اشعار پر نکتہ چینی کرو، تاکہ نہ صرف یہ ہو کہ

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

بلکہ ممکن ہے کہ پبلک کے چند اَن پڑھ افراد پر جادو چل جائے اور اُن کی نظروں میں یہ غالب سے برتر قرار پا جائیں، خواجہ آتش کو تو محض آڑ بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملے اور دُنیا یہ نہ کہے کہ یہ اشخاص کس قدر متکبر ہیں کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔

بہرحال میرزا یگانہ اور میرزا مراد دونوں نے جس خیال کے تحت بھی غالب پر نکتہ چینی کی ابتدا کی ہو یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ انکے اس گھروندے کو بگاڑ دے ان کی حیلہ سازیوں اور غلط گوئیوں کا پردہ تار تار کردے۔ میرزا مراد بیگ کی اس آرزو کا کتاب کے حرف حرف سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں غالب کے اچھے اشعار دیکھنے کی حسرت ہے، اُس کی فلسفیانہ شاعری سُننے کا ارمان ہے، اس کی زباندانی کے نمونے دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ کاش کوئی میرزا یگانہ کی سی شاعری کے نمونے غالب کے ہاں سے نکال دے، وہ قدم قدم پر اس اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں کہ انھیں غالب کے کلام سے بھی ویسے نمونے دیکھنے کا انتظار ہے جو انھیں یگانہ کے کلام میں ملتے ہیں۔ اگر وہ ذرا انصاف پسندی سے کام لیتے تو ان کو غالب کے مختصر سے دیوان سے ان تمام سوالات کا خاطر خواہ جواب مل جاتا مگر انھوں نے اتنی زحمت گوارا نہ فرمائی اور یہ کام دوسروں کے ذمہ ڈال دیا کہ وہ انھیں غالب کے دیوان سے نمونے اور مثالیں چُن چُن کر دکھائیں جس طرح بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کارنیوال میں تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ کامل اطمینان رکھیں۔ آیات وجدانی میں جس جگہ بھی اُنھوں نے کسی قسم کی ناواقفیت یا تمنا کا اظہار کیا ہے میں اُس عبارت سے مفصل بحث کروں گا۔ گو ان کی یہ آرزو کہ غالب کے اشعار کا میرزا یگانہ کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے اہل دانش و علم کے نزدیک ایک ایسا خبط ہے جسکا جواب خموشی ہی ہونا چاہیے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان کی یہ حسرت بھی نکل جائے ؎

ایں ہم اندر شاعری غمہائے بالائے دگر

مگر قبل اسکے کہ میں اس طرف قدم اُٹھاؤں یہ ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کا جو انھیں غالب کی طرف سے ہیں یا جن میں وہ لوگوں کو قصداً مبتلا کرنا چاہتے ہیں ازالہ کردوں۔

صفحہ ۱۷ سطر ۱۰

"کیا غالب کو نادان اور بے خبر پبلک کے سامنے اس ناگوار فرض خود ستائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیا غالب نے اپنے معاصرین پر حملے کرنے اور اُن کی قلعی کھول دینے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی"

تھوڑی دیر کے لیے اس بیان کی صحت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یگانہ غالب کے معاصر کیونکر ہوگئے۔ عصر کے معنی ہیں زمانے کے، اور یگانہ اور غالب کے زمانوں میں جو بُعد ہے وہ ہر شخص پر

ظاہر ہے۔ ممکن ہے میرزا یگانہ خواب میں شعرائے ماضی کی محفلوں میں شریک ہوئے ہوں جہاں غالب سے نوک جھونک کی نوبت آگئی ہو۔ مگر میرے خیال میں ایسا ہونا بہت بعید از قیاس ہے۔ شعرائے گزشتہ یگانہ جیسے مہمل شخص کو کبھی اپنی بزم میں قدم نہ رکھنے دیں گے اور بالفرض کسی طرح پہونچ بھی جائیں تو وہاں سے نکالے جائیں گے

محفل علم سے اس طرح نکلوائے گئے ؎ پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

جناب میرزا مراد صاحب۔ آپ کو یہ کس کتاب میں ملا تھا کہ غالب نے "فرض خودستائی" انجام دیا تھا، کیا غالب نے آیاتِ وجدانی کی سی کوئی کتاب لکھی تھی یا میرزا یگانہ کی طرح اپنی فضیلت اور بڑائی کا کبھی صور پھونکتے پھرتے تھے، یا تمام شعرائے نامی سے خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو ضروری کتابیں ہیں وہ تو آپ نظر انداز کر جاتے ہیں، اُن میں رقم شدہ واقعات سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور معلوم نہیں یہ "ایجاد بندہ اگر چہ گندہ" والی خبریں کس بھنگ خانہ سے سن کر بیان فرماتے ہیں جنکا نہ سر نہ پیر۔ غالب کے معاصر اصلی معنوں میں صرف دو اشخاص سمجھے جا سکتے ہیں۔ ذوق، مومن۔ کیا غالب نے کبھی ذوق کے خلاف اس دریدہ دہنی، اس سفید جھوٹ کے ساتھ بغض نکالا، زیادہ سے زیادہ کہا تو یہ ؎

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

کیا کبھی اس نے مومن کی مخالفت میں اس طعن و تشنیع کے ہمراہ، اس تعلّی و شیخی کے ساتھ پروپگنڈا کیا۔ کیا اسی کو آپ "قلعی کھول دینے" کی کوشش سے موسوم کرتے ہیں، کیا اس نے کبھی معمولی نوک جھونک کے علاوہ جو ہمعصر شعرا میں ہمیشہ عام رہی ہے کچھ اور کیا۔ جناب میرزا مراد صاحب پہلے غالب کا سا ظرف لائیے تب اس پر اعتراض کرنے کی سعی کیجیے، پہلے اُس کا سا عالی ہمت اور عالی حوصلہ شخص پیدا کیجیے پھر میرزا یگانہ کو اُس سے نسبت دیجیے ؎ حلوا خوردن را روئے باید۔ کیا یگانہ نے بھی کبھی اس پر اکتفا کی ؎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ یا ؎

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

غالب نے کس روش و وطیرہ اختیار کیا تھا جو میرزا یگانہ نے اپنا شعار بنا رکھا ہے کہ قدیم اور جدید، مشرق اور مغرب کے تمام شعرا کو ذلیل کیا جائے، سب کی ادبی خوبیوں پر حرف لایا جائے۔ اور پھر

پوچھو تو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صفحہ ۴۲ سطر ۱۲ "غالب کا اردو دیوان میرزا صاحب کے مختصر دیوان کے برابر بھی نہیں سکتا"

سطر ۱۶ غالب کے لیے اگر ناز فی الحقیقت ان کا فارسی کلام ہے اور خود غالب کا بھی یہی دعویٰ ہے"
جناب میرزا صاحب، غالب کا دیوان کون طلسم ہوش رُبا یا بوستان خیال کی طرح ضخیم ہے جو آپ نہایت تمکنت سے فرماتے ہیں کہ "میرزا یگانہ کا مختصر دیوان"۔ غالب بیچارے کی تو تمام پونجی سَو صفحوں سے زیادہ نہیں ہے اور آپ کے میرزا یگانہ کے تو دفاتر اب بھی اشاعت کے لیے باقی ہیں اور جو چھپ چکے ہیں وہی کون کم ہیں۔ گیا نشتر یاس، اور آیات وجدانی مجموعۂ دیوان غالب سے مختصر تر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب نے اپنا بہت سا حصۂ کلام اپنی زندگی میں دیوان سے نکال دیا تھا۔ تاہم اگر اسے ملا بھی لیا جائے تو بھی اس کا سب کلام یگانہ کے کلام سے کم ہوگا۔

دوسرا دعویٰ شاید میرزا صاحب غالب کے ان اشعار کے زور پر کرتے ہیں

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم　　من بہ غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن جناب میرزا صاحب۔ یہ بھی تو غالب ہی کا فرمودہ ہے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

صفحہ ۱۷۱ سطر ۸

"غالب کی سرقہ یا مستعار originality جدت طرازی کیا اس حقیقی جدت طرازی کے مقابلے میں ٹھہر سکتی ہے"

پہلے تو میرزا مراد صاحب وہی پرانی ٹھوکر کھاتے ہیں کہ دعویٰ بے دلیل، اس لیے انصافاً تو اسے مہمل سمجھ کر خارج کر دینا چاہیے مگر میرزا صاحب کے مزید اطمینان اور تسکین قلب کے لیے میں اس عبارت سے بھی بحث کرتا ہوں۔ جناب میرزا صاحب، شاعری میں آپ سرقہ یا مستعار کسے کہتے ہیں، اس مسئلے میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی یہ کہ غالب مرحوم نے دوسروں کے اشعار سامنے رکھ کر ان کے مطالب کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا۔ گستاخی معاف میں تو غالب کی طرف سے اس کا گمان نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف غالب کی ایمانداری پر حرف گیری کر رہا ہوں بلکہ تمام گزرے ہوئے اساتذہ کو سارق مضامین فرض کیے لیتا ہوں کیونکہ اردو کے کسی شاعر کا کلام فارسی شعراء کے مضامین سے خالی نہیں اور خود فارسی شعراء کے یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اُلٹ پھیر کر مضامین اور تخیلات ہی آتے ہیں انداز بیان جدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو غالب کے دماغ میں بھی خود بخود بعینہٖ وہی تخیل پیدا ہوئی جو شعرائے گزشتہ کے اشعار میں موجود تھی۔ اس صورت میں کسی طرح

بھی غالب کو سارق اور مستعار لینے والا، نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور ایسا ہونا کچھ بعید از قیاس یا ناممکن نہیں۔ دو اشخاص جب ایسی درجۂ ذہانت کے ہوتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے دماغوں میں بالکل وہی خیالات، مطلق غیر ارادی طور پر، قطعاً جدا جدا، آتے ہیں، فرق صرف وقت کا ہوتا ہے اور ہیں چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ غالب کا درجۂ ذہانت دنیا کے کسی شاعر کے درجۂ ذہانت سے کمتر تھا اس لیے اسے سارق مضامین کہنا کیا معنی رکھتا ہے ؎ من نہ آنم آں کہ ایں افسانہا باور کنم۔

پھر اس کے سوا اُردو، فارسی، انگریزی، لاطینی، عربی، سنسکرت، کس زبان کا کونسا شاعر ایسا ہے جسکے یہاں تمام مضامین محض اُسی کی تصنیف اور تخئیل ہوں، اردو اور فارسی شعرا کی بابت اگر اس کا ثبوت درکار ہو تو اولڈ بوائے، بابت نومبر ۱۹۳۷ء میں قاضی تلمذ حسین صاحب کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

کسی فلسفی کا قول ہے "سورج کے زیر سایہ کوئی شے نرالی اور جدید نہیں"

(There is nothing orginal under the sun)

پھر آخر میرزا صاحب جدت طرازی کسے کہتے ہیں، مسروقہ اور مستعار خیالات سے ان کا کیا مطلب ہے اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اُردو کلام میں کہیں بھی ایسے نمونے نہیں ملتے جنھیں اُسکی اور صرف اُسی کی طرف منسوب کیا جا سکے، تو آئیں، محض تفریح طبع کے طور پر، صرف تفنن مزاج کی خاطر، ان چند اشعار کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ساتھ یہ خیال رکھیں کہ غالب کے یہاں ایسے سیکڑوں اشعار موجود ہیں :—

(۱) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ... رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
(۲) گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ... رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
(۳) صفا از حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر ... تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
(۴) دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا ... یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
(۵) ہمت دونوں میں تغافل نے ترے پیدا کی ... وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
(۶) گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے ... اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
(۷) توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ... آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

} غالب

اب آئیے اور میرزا یگانہ کے کلام سے چند اشعار کا مطالعہ کیجیے جن کو میرزا مراد صاحب کے معیار کے مطابق مسروقہ کہا جا سکتا ہے :—

	یگانہ آرٹ		اشعار غیر
(۱)	آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے	صفحہ ۲۳۸	خزاں کے دن جب آئے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں بتاتا تھا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا
(۲)	کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا	صفحہ ۹۹	بشر کو چاہیے پاس دل بشر رکھے کسیکا ہوکے رہے یا کسی کو کر رکھے "اچھا نہیں ہے کھونا ایام نوجوانی ؛ اپنا کسیکو کر لو یا ہو رہو کسی کے
(۳)	ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں	صفحہ ۲۱۱	وائے ناکامیِ قسمت کا تماشا سینئے میں نے ان آنکھوں سے لٹتے ہوئے گھر دیکھ لیا

صفحہ ۲۶۶ سطر نمبر ۹

"غالب نے اتنی عمر پائی مگر ضمیر ملامت شعار کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی"

میرزا صاحب، جب آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو اس قدر لغو اور فضول دعوے کیوں کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو آپ کہتے ہیں کہ "غالب کے یہاں اگر اسکا جواب نکل آئے تو کیا کہنا" دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "غالب نے ضمیر ملامت شعار پر کوئی روشنی نہیں ڈالی" اس سے آخر کوئی کیا مطلب نکالے، خود ہی آپ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے خود ہی پھر اس طرح رطب زنی کرتے ہیں گویا غالب کا پورا دیوان چاٹ چکے ہیں، اگر خدا توفیق دے تو ذرا غور سے اس بیچارے کے دیوان کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کتنے رنگا رنگ مضامین سے اسکا دیوان بھرا ہوا ہے۔ فی الحال یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ کو اپنے دعوے کے بطلان کا علم ہو جائے ان اشعار میں گو اُس نے ضمیر ملامت شعار سے بحث نہیں کی ہے کیونکہ اتنا مہمل اور دور از قیاس خیال اُسکے ذہن میں آتا ہی نہ تھا لیکن میرزا یگانہ نے جس تخئیل کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے

سہو و خطا ودیعت فطرت سہی مگر ؛ سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو (یگانہ)

اس سے ملتی جلتی تخئیل کی طرف غالب نے کتنے دلکش پیرایہ میں حسب ذیل اشعار میں اشارہ کیا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد ؛ مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ؛ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (غالب)

کتاب بھر میں اسی نوع کی غلط فہمی یا غلط بیانی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اب اس کی حاجت نہیں کہ ان سب کا الگ الگ جواب دیا جائے۔ جو جوابات دیے جا چکے ہیں ان کی بدولت پر امید ہے کہ آیات وجدانی کے ناظرین بقیہ مہملات کو "صدا بصحرا" سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ اب ضرورت

اس کی ہے کہ جو اعتراضات غالب کی شاعری کے متعلق کیے گئے ہیں اُن کو فرداً فرداً رد کیا جائے
اور ناظرین پر ظاہر کر دیا جائے کہ گو بے عیب ذات خدا کی ہے لیکن غالب کے اشعار اور انکی قوتِ
شاعری کے خلاف جو حملے آیاتِ وجدانی میں کیے گئے ہیں وہ صرف حاسدانہ عیب بیں نگاہوں
کی کورانہ کوتاہ بینی نکتہ چیں اور جانبدار نگاہوں کی لایعنی تحقیقات ہیں عبارت کے ساتھ بصیرت
کا ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف اُردو کے چند الفاظ کے معانی یاد کر لینے سے آدمی نقاد نہیں بن جاتا!
چند مخصوص محاوروں اور ترکیبوں کی تک بندی سے انسان شاعر نہیں ہو جاتا۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

صفحہ ۱۲۱ "یہاں جن مضحکہ انگیز جدتوں کا ذکر ہے ان کی مثالیں جس کثرت سے غالب
کے یہاں ملیں گی وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ غالب کا مشہور مصرعہ ہے   دل بدست
و پا اُفتادہ برخوردار بستر ہے۔ دل بدست و پا کے ساتھ افتادہ کا اضافہ اردو میں کتنا
مضحک ہے اور دل بدست و پا کو برخوردار بستر کہنا شہری دماغوں کے لیے کتنی بڑی دل لگی ہے"
میرزا مراد بیگ شیرازی اپنے نام کے ساتھ شیرازی کا دم چھلا لگائے ہوئے ہیں اور پھر بھی اس
مصرعہ کی ندرت سمجھنے سے قاصر ہیں نہ صرف یہ بلکہ انھیں اس میں کوئی جدت ہی نہیں معلوم
ہوتی اور جو جدت ہے وہ انھیں مضحک اور شہری دماغوں کے لیے دل لگی کا باعث نظر آتی ہے
ان کا دماغ برخوردار بستر کے معانی سمجھنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھاتا ہے انھیں غالب کی اس جدت
طرازی پر ہنسی آتی ہے مگر یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے شہری دماغوں پر لوگوں کو زیادہ ہنسی آتی ہوگی وہ
اس کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ بھی پڑھ لیں جس کا دوسرا مصرعہ وہ
پیش کر رہے ہیں اور جس پر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پہلا مصرعہ یہ ہے   "سرشک سر بصحرا دادہ
نور العین دامن ہے" دادہ کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں افتادہ، نور العین کی نسبت سے برخوردار
کتنی بلاغت کا نمونہ ہیں، پھر سر بصحرا کے ساتھ دادہ کا لفظ لگا کر اور دل بدست و پا کے ساتھ افتادہ کا
اضافہ کر کے غالب نے معانی میں جو وسعت اور مطلب میں جو تبدیلی پیدا کی ہے وہ میرزا صاحب کی
عقل میں نہیں آتی۔ اس موقعہ پر مجھے ہندوستان کے ایک مشہور شاعر (جو شاعر تو اچھے ہیں لیکن ان کی
علمی قابلیت واجبی واجبی ہے) کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جگر مرادآبادی کی ایک غزل ہے جس کی
ردیف ہے "پی گیا"۔ ایک صاحب نے اعتراضاً کہا کہ شروع سے آخر تک غزل بھر میں کہیں بھی اس
طرف اشارہ نہیں کہ کیا چیز پی گیا؟ اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل مہمل تھا کیونکہ غزل کا ہر مصرعہ

پکار پکار کے یہ کہتا ہے کہ پی گیا ہے مقصد شراب کا پی جانا ہے لیکن اعتراض کا جواب جو دیا گیا وہ اعتراض سے زیادہ پُر تعجب ہے۔ جواب دینے والے صاحب نے فرمایا کہ ــــ "یہ تو کوئی بات نہیں، اُردو کے اور شعرا نے بھی ایسا کیا ہے مثلاً ــــ اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا" ــــ یہ مصرعہ امیر مینائی کا ہے اور پورا شعر یوں ہے

وہ مست ہوں کہ ساغر مے جیب میں پا گیا اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

پہلا مصرعہ دیکھ کر ہر شخص آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اعتراض کے جواب کی حد تک جواب کس قدر مضحکہ خیز تھا۔ لیکن یہاں جواب دینے والے سے سہو ہوا تھا۔ میرزا مراد قصداً غالب کا پہلا مصرعہ نظر انداز کر جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالیں۔ کیوں جناب میرزا صاحب کیا میرزا یگانہ [جن کے آپ "بقول خود" پسندیدہ ہیں] کے یہاں اس نوع کی فارسی ترکیبیں نہیں ہیں، اگر شک ہو تو ذیل کی ترکیبیں ملاحظہ فرمائیے۔

گوش بر آواز، درِ چشمِ نامحرم کجا (کیا یہاں کجا کے بجائے کہاں نہیں استعمال ہو سکتا تھا)

خانہ بدوشِ رہگزر، رنگ و بوے رائیگاں، محوِ طلسم بندیِ نقش ونگار، دست و پا گم کرنا

[دست و پا گم کردن کا ترجمہ]

صفحہ ۲۶ :- "میرزا صاحب (میرزا یگانہ) کا کلام میرزا غالب کی طرح محض حسنِ معنوی کا مظہر نہیں"

اس کو پڑھ کر پہلے تو مجھے تعجب ہوا کہ آخر میرزا مراد کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ غالب کا کلام محض حُسنِ معنوی کا مظہر ہے، کیونکہ اُنھوں نے آیات وجدانی میں جابجا اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ غالب کے دیوان کا مطالعہ کرنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں، جگہ جگہ ایسے فقرے لکھے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے غالب کا کلام نہیں پڑھا ہے ... پھر میں نے سوچا کہ تعجب کرنا خود حماقت ہے۔ یہ دونوں میرزا صاحبان [میرزا مراد و میرزا یگانہ] بغیر سوچے سمجھے، بلا دلائل و براہین، جو چاہتے ہیں لکھ مارتے ہیں ؎

ہر لحظہ بہ شکلِ دگر آں یار بر آمد

اول تو مجھے میرزا مراد سے یہ دریافت کرنا ہے کہ غالب کے یہاں جو کچھ حسنِ معنوی ہے اسی کا مقابلہ یگانہ نے کہاں تک کیا ہے جس رفعت تک اسکا مرغِ تخیل جاتا تھا اُن بلندیوں تک میرزا یگانہ کی تخئیل کی لنڈوری بٹیر کبھی بھی پہونچی [اقبال نے غالب کی تخئیل ہی کے متعلق کہا ہے

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا]

جس نکتے کو اس کی باریک بیں نظریں دیکھ لیتی تھیں اس کا عشر عشیر بھی میرزا یگانہ کی موتیا بند نما آنکھوں نے

دیکھا جس فلسفے کو وہ سمجھ لیتا تھا اُس کی ابجد سے بھی میرزا یگانہ کو کبھی واقفیت ہوئی ۔ غالب کا پورا دیوان تو دُور رہے، اُس کی ایک غزل کے چند اشعار میں درج کرتا ہوں ۔ ان اشعار کے حسن معنوی [حسن ظاہر کو جانے دیجیے] کا لحاظ رکھتے ہوئے میرزا مراد یہ بتائیں کہ یگانہ نے کبھی بھی چھوٹی بحروں کی غزلوں میں اس پایہ کے جذبات کا اظہار کیا

۱- ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
۲- آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
۳- موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
۴- ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
۵- مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
۶- کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی

اب آیئے غالب کے کلام کی ظاہری خوبیوں پر ۔ جناب میرزا مراد صاحب، آپ نے آیاتِ وجدانی میں متعدد بار دہرایا ہے کہ "غالب کے لیے اُردوے معلّٰی میں ایسا شعر کہنا ناممکن ہو" ممکن ہے کہ اُردوے معلّٰی کے معانی آپ کے ذہن میں بالکل جدا ہوں، کیونکہ آپ ہر چیز کا مطلب بالکل اُلٹا سمجھتے ہیں، جو عام طور سے اشخاص کے ذہن میں ہوتا ہے ۔ مگر جو تصورِ اُردوے معلّٰی کا عوام کے دماغ میں ہے اُس میں اگر آپ کو غالب کی قابلیت کے متعلق شک ہو تو اُس کے خطوط کا مطالعہ فرمایئے ۔ دماغی تکلیف تو ضرور ہوگی مگر آپ کو علم ہو جائے گا کہ اُردوے معلّٰی میں کسے زیادہ دستگاہ حاصل تھی، غالب مرحوم کو یا یگانہ کو ــــــ رہا اشعار کا معاملہ، تو اگر آپ انصاف کی عینک لگا کر دیکھتے تو اُس کے مختصر سے دیوان میں آپ کو ہزاروں نمونے مل جاتے ۔ بیشک غالب کے بعض اشعار ایسے ضرور ہیں جن میں فارسیت کا غلبہ ہے، لیکن بہرحال ان اُس کے کلام کا بیشتر حصہ اس معیار سے جس کی بنا پر آپ نے یگانہ کے کلام کو خالص اُردو کا کلام کہا ہے صرف اُردو ہی ہے اور اس میں حُسنِ ظاہری کے ایسے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن تک یگانہ جیسوں کے دماغ کی رسائی ناممکن ہے ۔ مثال کے طور پر میں یہاں دس اشعار لکھتا ہوں زیادہ خلش ہو تو دیوان غالب دیکھیے ۔

(۱) ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
(۲) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(۳) اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ تھا وہ یکتا | جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

(۴) مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند کہ سر جائے | جلاد کو لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور

(۵) تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے | پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

(۶) رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع | ہوئی ہے آتشِ گُل آبِ زندگانیِ شمع

(۷) زبانِ اہلِ زباں ہے مرگِ خاموشی | یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

(۸) آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک | کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(۹) حسن اور اُس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم | اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

(۱۰) کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی | بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

صفحہ ۱۰۰:—

"دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں | وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا"

سچ پوچھو تو یہ غالب کے بس کی بات ہی نہیں کہ ایسی الہامی زبان میں مافی الضمیر کو واضح کر سکے۔

دلِ بے حوصلہ کو ذرا سی ٹھیس کا مہمان' کہنا ضرور فصاحت کی جان ہے لیکن یہ کہنا کہ جو غم نہیں کھا سکتا وہ آنسو کیا پیے گا' سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ شاید یگانہ کے نزدیک غم کھانا آنسوؤں کے پینے سے سہل تر ہو، اور کسی میں تو اتنی کم ذوقی ہو نہیں سکتی۔

اس شعر میں جو ظاہری حُسن ہے صرف اُسی کے زور پر اگر اس شعر کو الہامی تصور کر بھی لیا جائے اور اس کے معنوی سقم سے قطع نظر کی جائے تو بھی یہ نتیجہ نکالنا کہ اُردو کے کسی اور شاعر اور خصوصاً غالب کو زبان پر اتنی قدرت نہیں تھی کہ اس قسم کے صنائع و بدائع کے ساتھ شعر کہہ سکے واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

امیرؔ مینائی" بیمارِ محبت نے کبھی منہ نہ لگایا | تاثیر گھُلی جاتی ہے اس غم سے دوا میں

انیسؔ پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی | ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

نسیمؔ لکھنوی صندلی رنگوں سے مانا دل ملا | دردِ سر کی کس کے ماتھے جائیگی

ذوقؔ کیا تاب دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے | دوزخ بھی ہو تو ان کی چلموں پہ آگ رکھے

غالبؔ (۱) لے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی | سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

(۲) میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی | لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

صفحہ ۹۲ "امید و بیم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا — چراغ گُل ہوا جب آستانۂ دل کا"

میرزا امراد یگانہ کے مندرجۂ بالا شعر کا تقابل غالب کے مندرجہ ذیل شعر سے کرتے ہیں

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اور اُنھیں یہی نظر آتا ہے کہ یگانہ کا شعر افضل ہے، ان کی نگاہ میں "آستانۂ دل کا چراغ گُل ہونا" بجائے خود ایک شعر کا حکم رکھتا ہے مگر انھیں "ذوق وصل و یادِ یار کا باقی نہ رہنا" ایک دفتر تغزل کا مرادف نہیں دکھائی دیتا، ان کا دماغ "اُمید و بیم کا راستہ چھوڑ دینے" کو زیادہ سراہتا ہے لیکن "آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا" کی خوبی کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ کیا کسی صاحب ذوق کے خیال میں میرزا یگانہ کے شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں وہ معنویت ہے جو غالب کے مصرعۂ ثانی میں ہے۔ کیا کسی اہل نظر کی نگاہ میں "آستانۂ دل کا چراغ گُل ہونے" میں وہ جامعیت ہے جو غالب نے "ذوق وصل و یادِ یار باقی نہ رہنا" کہکر پیدا کی ہے۔ علاوہ بریں یگانہ کے شعر کے مقصد میں کوئی ندرت نہیں صرف الفاظ کا گھروندا ہے۔ محض ایک ڈھکوسلا ہے جس کی مراد بیگ نے اس قدر تعریف کی ہے

اے وائے ہمارے اگرایں ست ہمارے

صفحہ ۹۸ "لحد سے بڑھ کے نہیں گوشۂ راحت — قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا"

بھلا اس قیامت آئی کا کیا جواب ہو سکتا ہے یہی وہ انداز بیان ہے جس پر غالب کا کبھی دسترس نہ ہوا۔"

واللہ کیا زبان ہے اور کتنا صحیح طرزِ تحریر ہے۔ اجی جناب میرزا امراد صاحب خود ہی تو آپ کتاب بھر میں چیخے ہیں کہ اہل لکھنؤ کے یہاں سوائے زبان کی چاشنی کے اور کیا رکھا ہے۔ بجز صنایع و بدائع ظاہری کے کچھ نہیں ہے اور خود ہی صرف اس اتنے سے ٹکڑے "قیامت آئی" پر اتنا غوغا مچاتے ہیں گویا صور اسرافیل پھونک رہے ہیں۔ ذرا انصاف سے سوچیے کہ بجز اس ٹکڑے کے شعر میں اور کوئی خوبی بھی ہے۔ مہمل سا، فرسودہ، پامال مضمون جو خدا جھوٹ نہ بلوائے سیکڑوں شعرا اس سے بیشتر باندھ چکے ہیں، اور آپ ہیں کہ اس کی ستائش میں رطب اللساں ہیں، زمین آسمان ایک کیے دیتے ہیں۔ آپ کی شعر فہمی کی حقیقت تو اسی سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت غالب تو دور ہے، اسکے ایک معتقد نے ایک شعر کہا ہے جس میں "قیامت ہوگی" کی خوبی پر آپ نظر ڈالیے تو آپ کو پتہ چلے کہ یگانہ کا دعوے زباندانی، اور اس کی تائید میں آپ کی قصیدہ خوانی کہاں تک قرین قیاس ہے۔ شعر یہ ہے

مرنے والوں کے مزاروں کو نہ ٹھکرائیں حضور — یہ اگر اٹھ کھڑے ہونگے تو قیامت ہوگی۔ (راحت رامپوری)

غالب کی ایک غزل ہے جس میں بحر اور قافیہ مختلف ہیں مگر ردیف یہی ہے پریشاں نکلا عریاں نکلا ذرا اس غزل کے دو ایک اشعار سے یگانہ کی اس غزل کا مقابلہ فرمائیے تو فرق مراتب ظاہر ہو گا، ویسے بھونکنے کو تو کتا بھی بھونک لیتا ہے۔

صفحہ ۱۰۹ پر یگانہ کی غزل ہے' منظر کھلا' دفتر کھلا' ان کی بدقسمتی سے غالب نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہے، میں چند اشعار کا مقابلہ کیے دیتا ہوں، میرزا مراد کو اس کی حسرت بھی بہت ہے ان کی آرزو بھی پوری ہو جائیگی

مطلع
شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
غالب

واں نقاب اٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا
یا کسی کے حسن عالمتاب کا دفتر کھلا
یگانہ

غالب کے شعر میں جو نادر تشبیہ ہے اس کے مقابلہ میں یگانہ کے ہاں دونوں مصرعوں میں وہی فرسودہ تشبیہیں " یار کا چہرہ حشر کا منظر ہے" "یار کا چہرہ حسن میں عالمتاب ہے" وہی پامال انداز بیان یا کسی کے حسن کا دفتر کھلا

جلیل کا شعر ہے
نقاب کہتی ہے میں پردہ قیامت ہوں
اگر یقین نہ ہو دیکھ لو ہٹا کے مجھے

امانت کا شعر ہے
تا قیامت نہ دکھاؤ گے فلک پر چہرہ
میرا محبوب جو لے شمس و قمر دیکھ لیا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
غالب

اشک خوں سے زرد چہرہ پر ہے اک طرفہ بہار
دیکھیے رنگ جنوں کیسا مرے منہ پر کھلا
یگانہ

کہاں ہیں میرزا مراد۔ دیکھیں غالب کے شعر میں کتنا نایاب انداز بیان ہے منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ کھلتا ہی نہیں کیا اب بھی غالب کی قابلیت پر، اس کی زباندانی پر انھیں اعتراض ہے۔ اور کچھ ان اشعار کے متعلق کہنا بے سود ہے۔ غالب کے شعر کی گرد کو بھی یگانہ کا شعر نہیں پہنچتا

غالب
انکی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

یگانہ
رنگ بدلا پھر ہوا کا میکشوں کے دن پھرے
پھر چلی باد صبا پھر میکدے کا در کھلا

یہاں بھی فرق مراتب ظاہر ہے، یگانہ کا مضمون کس قدر فرسودہ اور طرز ادا کس درجہ پامال ہے۔

ان کے علاوہ اور ہم قافیہ اشعار نہیں۔ لیکن یگانہ کو اپنے ذیل کے اشعار پر بےجا ناز ہے اور ان کی تعریف میں جس فخر و مباہات سے وہ کام لیتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکو یہ مغالطہ ہے کہ اس بحر میں اور اس ردیف میں کوئی دوسرا شخص اس پایہ کے اشعار نہیں لکھ سکتا۔

صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چلا تھا یار کا ۔۔۔ چونکتے ہی حسرتِ دیدار کا دفتر کھلا (یگانہ)

چھپ لگی مجکو، گناہِ عشق ثابت ہو گیا ۔۔۔ رنگ چہرے کا اُڑا رازِ دلِ مضطر کھلا

ان تین اشعار کے مقابلہ میں غالب کے تین شعر بھی سُن لیجیے۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب ۔۔۔ آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُسکا بھید ۔۔۔ پر یہ کیا کم ہے کہ مجھسے وہ پری پیکر کھلا (غالب)

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول ۔۔۔ آج اِدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

اربابِ نظر اور اصحابِ ذوق خود فیصلہ کرلیں کہ غالب کے اشعار کے سامنے یگانہ کے شعروں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

صفحہ ۱۱۵

(۱) قصہ کتابِ عمر کا کیوں مختصر ہوا ۔۔۔ رُخ داستانِ غم کا اِدھرے اُدھر ہوا (یگانہ)

اس شعر کی تعریف کرنے میں بھی میرزا مراد غالب کے مُنہ آئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یگانہ کا اس شعر سے غم کے فلسفہ جاودانی کو ثابت کرنا اصلیت سے کوسوں دُور ہے آج تک کہیں بھی یہ درس نہیں دیا گیا کہ غم جاودانی ہے اور فنا کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ فلسفیوں، مصلحوں، پیغمبروں، کسی کے اقوال سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ پھر اگر غالب نے وہی بات کہی تو کیا بُرا کیا اُردو کے اور شعرا نے بھی یہی کہا ہے۔

(۱) [مومن] چھُٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ۔۔۔ ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

(۲) [آزاسلام] غم رہا جب تک کہ دم میں دَم رہا ۔۔۔ دَم کے جانے کا نہایت غم رہا

اسی صفحہ پہ ایک اور مہمل شعر ہے

ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے ۔۔۔ اے وائے دردِ دل نہ ہوا دردِ سر ہوا (یگانہ)

اس کے متعلق میرزا مراد قمطرازی فرماتے ہیں

"یہ انداز بیان اور قوتِ استدلال غالب کے یہاں خال خال نظر آتی ہے"

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس قسم کی لغو تخئیل پر مبنی اشعار کہنا غالب گوارا ہی نہیں کرتا تھا۔

صفحہ ۱۱ "جامہ زیباں پہ کفن نے بھی دیا دہ جوبن ۔۔۔ دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا" (یگانہ)

اس شعر میں مصنف کی رنگینیِ بیان قسم کھانے کے قابل ہے۔ ایک منشی فاضل کی شامت آئے غالب کا ایک شعر میرزا صاحب کے سامنے بڑے فخریہ انداز سے پڑھ کر ندرتِ تخئیل کی داد چاہنے لگے

ایک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں ۔۔۔ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی (غالب)

میرزا صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ جناب والا منشی فاضل کی سند حاصل کر لینا اور بات ہے اور شعر و سخن پر محاکمہ کرنا اہل الرائے کا منصب ہے، سنیے اور سمجھیے کہ عرفی کے اس شعر کے مقابلے میں غالب کے شعر کی کیا حقیقت ہے۔

حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت   تا شہیدانِ تو گلگوں کفنے ساختہ اند   (عرفی)

آپ نے دیکھا، میرزا یگانہ نے اپنا اہل الرائے ہونا کس طرح ثابت کیا، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ میرزا مراد نے کس نخریہ انداز میں یگانہ کے اس بے معنی اعتراض کی تائید کی۔

خر عیسیٰ ست ایں رنگیں بیا وائید پالانش

ایک شاعر کوئی عمدہ شعر کہدے تو اس کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ دنیا کے تمام اشخاص کسی دوسرے شاعر کا ہم مضمون شعر پڑھنا ترک کر دیں۔ ایک فارسی شعر کے اچھے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ کہ اردو کا ہم معنی شعر خوب ہو ہی نہیں سکتا۔ میرزا مراد فرماتے ہیں

حق یہ ہے کہ عرفی کے شعر کے مقابلے میں غالب کا شعر پانچ فیصدی نمبر پانے کا بھی مستحق نہیں ہے"

کیا اس سے کسی طرح یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس بیچارے منشی فاضل نے یگانہ کو غالب کا شعر سنا کر گناہ عظیم کا ارتکاب کیا تھا۔ کیا اس سے کہیں یہ استدلال ہوتا ہے کہ یگانہ کا شعر غالب کے شعر سے اچھا ہے۔ بظاہر تو ان سب امور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بجائے اس منشی فاضل کے یگانہ اور میرزا مراد میں شعر فہمی اور سخندانی کا فقدان ہے "شئے لطیف کی کمی ہے۔

ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

علاوہ بریں غالب اور عرفی کے اشعار کے معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عرفی شہیدوں کے لباس کی گلگونی پر اہل بہشت (جس میں حوریں، غلمان اور دوسرے ساکنان خلد سب شامل ہیں) کے رشک کا عالم دکھاتا ہے۔ غالب کفن کے "گرد روں بناؤ" سے شہیدوں کے حسن و خوبصورتی کی اس قدر افزائش کرتا ہے کہ حوریں (صرف حوریں) تک متاثر ہو جاتی ہیں، فارسی پھر فارسی ہے اور اردو پھر اردو،

زبان پہاڑی کی ہمزبانی ہو نہیں سکتی

دونوں کا کیا مقابلہ، عرفی کے شعر کی رنگینی برحق مگر میری رائے میں عرفی کے شعر کے مصرعہ اول [حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت] میں وہ معنویت، وہ جامعیت، وہ ندرتِ تخیئل نہیں جو غالب کے شعر کے ... سے مصرعہ میں جو ایک پہلو اصلیت و سادگی کا ہے وہ عرفی کے مصرعہ سے معدوم ہے۔ پھر

اگر عرفی کے یہاں "سوختہ انداز غیرت" ہے تو غالب کے یہاں بھی "پڑتی ہے آنکھ" ہے جو اُردو میں اتنا ہی جامع ہے جتنا فارسی میں عرفی کے شعر کا ٹکڑا، بہر حال گو مجموعی طور پر میں غالب کے شعر کو عرفی کے شعر پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں لیکن یگانہ اور مراد کی طرح یہ کہنے پر بھی رضامند نہیں کہ "غالب کا شعر عرفی کے شعر کے مقابلہ میں پانچ فیصدی نمبروں کا بھی مستحق نہیں"۔ اگر عرفی کا شعر بس ہے تو غالب کا انیس، عرفی کا شعر آفتاب ہے تو غالب کا شعر ماہتاب، عرفی کے شعر پر اگر رنگینی صد بہارستان معنی بھی فدا ہیں تو غالب کے شعر پر شادابی صد ہزار گلستان نکتہ آفرینی قربان

ہیں دونوں ایک ہی سے کچھ ذرا چڑھتے اُترتے ہیں

میرزا مراد پھر گل افشاں ہیں

"عرفی و غالب نے تو شہیدانِ عشق کے کفن کی رنگینی کا نقشہ کھینچا ہے مگر میرزا یگانہ کی جرأت فکر نے جامہ زیبی کی ایسی بہار دکھائی ہے جو اَب تک کہیں دیکھنے میں نہیں آئی"

میرزا مراد شاید افریقہ کے کسی جنگل کے رہنے والے ہیں جو اُنھوں نے اب تک اس "آزاد نگاہ" جامہ زیبی سے بہتر جامہ زیبی کی بہار نہیں دیکھی ہے۔ ارباب نظر اسکا خوب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یگانہ کا شعر باوجود میرزا طو کی اتنی جھوٹی تعریف کے عرفی اور غالب کے اشعار کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ میرزا مراد غالب کو پانچ فیصدی نمبر دینے پر تیار نہیں تھے، میں یگانہ کو ایک نمبر دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر یگانہ میں تغزل کی وہ روح نہیں ہے جو اور شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یگانہ کے کلام کی اتنی بے وقعتی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے اکثر اشعار بہت روکھے پھیکے، سوز و گداز سے معرا، لذت درد سے خالی، اصلیت سے دور ہوتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۹ پر یگانہ کی ایک ورغزل شرح ہوئی ہے جسکے متعلق میرزا مراد نے خود اشارہ کیا ہے کہ غالب کی غزل سے ملا کر دیکھی جائے۔ ان کے حسب ارشاد یہ بھی پیش کیے دیتا ہوں۔ ناظرین غور فرمالیں کہ یگانہ کی غزل کی غالب کے اشعار کے سامنے کیا حیثیت ہے۔

غالب		یگانہ
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا		تکتے ہیں پاس دُور سے منہ آپ کا ہنوز آنکھیں تو رہ گئی ہیں مگر دل نہیں رہا

کیا دونوں اشعار میں کوئی بھی نسبت ہے۔

غالب		یگانہ
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا		پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا

یگانہ کے شعر کا مصرعہ اُولیٰ اور دوسرے مصرعہ میں بارِ خاطرِ محفل، کی ترکیب ضرور قابلِ تحسین ہیں مگر غالب کے بلند تخئیل اور شمع کشتہ کے درخورِ محفل نہ رہنے کے ثبوت نے یگانہ کے شعر کو گرد کر دیا۔

غالب	دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا	پہونچی نہ اُڑ کے دامنِ عصمت پہ گرد تک اس خاک اُڑانے کا کوئی حاصل نہیں رہا	یگانہ

غالب کے شعر کے مقابلہ میں یگانہ کا شعر پھینکدینے کے قابل ہے۔ کیا انداز ہے "حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا"۔ علاوہ بریں یگانہ کے شعر میں دو بہت واضح سقم ہیں۔ اول تو مصرعۂ ثانی میں مصرعۂ اولیٰ کی مناسبت سے 'رہا' نہیں ہونا چاہیے، 'ہوا' سے زیادہ صحیح مطلب نکلے گا۔ یا مصرعہ اولیٰ پھر یوں ہو۔ پڑتی نہیں ہے دامنِ عصمت پہ گرد تک دوسرے اس شعر کے جو معنی ہوتے ہیں وہ حقیقی جذبات سے کوسوں دُور ہیں۔ کسی عاشق کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اس کے محبوب کے "دامنِ عصمت پر گرد پڑے ممکن ہے یگانہ کی نظروں میں۔ دامنِ عصمت پر گرد پڑنے ——— کے معنی دوسرے ہوں۔

مندرجہ بالا اشعار کے سوا اور بھی شعر دونوں کی غزلوں میں ہیں گو ہم قافیہ نہیں۔

غالب	یگانہ
(۱) مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا	(۱) رکھتے نہیں کسی سے تسلی کی چشمداشت دل تک اب اعتبار کے قابل نہیں رہا
(۲) بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا	(۲) آہستہ پاؤں رکھیے قیامت نہ کیجیے اب کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا
(۳) وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا	(۳) یاد آئی بوئے پیرہنِ یار نا صحا اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا
(۴) گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا	(۴) دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا محمل نشیں تو رہ گیا محمل نہیں رہا

میرزا یگانہ کی قابلیت کا راز تو اسی سے کھلا جا رہا ہے کہ چار میں سے تین شعر قابل کے قافیہ میں ہیں۔ اور کوئی قافیہ ان سے سنبھلا ہی نہیں، برخلاف اس کے غالب نے کتنے مشکل قافیے کس خوبی سے نبھائے ہیں خصوصاً پہلا شعر بہت بلند ہے اور صحیح رنگِ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے۔ یگانہ کے چاروں شعر نہ معلوم کس بدحواسی کا نتیجہ ہیں۔ بے اعتباریِ دل کا رونا بے شمار شعرا رو چکے ہیں اور اس اسا

نئے انداز سے مضمون کو باندھا ہے کہ اب کوئی گنجائش ہی باقی نہیں۔ غالب ہی کا اس غزل کا مطلع دیکھیے۔ بھلا کیا اب کوئی اس مضمون پر ہاتھ ڈال کر اپنی شاعری کا بھرم کھلوائے گا۔ یگانہ کے پہلے شعر کا ماخذ بھی یہی مطلع ہے جسکو انھوں نے بگاڑ کر نہایت بھونڈے طریقے سے اپنا بنانا چاہا۔

شعر ۲ کے لیے میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ — تک رہا ہوں خودی میں کیا کیا کچھ۔ آہستہ پاؤں کہاں رکھیے، معشوق یگانہ کے دولت خانے پر تشریف فرما ہوا ہے' یا یگانہ کی قبر پر سے گزر رہا ہے آخر کیا معاملہ ہے۔ پھر — قیامت نہ کیجیے — کا محاورہ نہ معلوم کس جنگل سے پکڑ کر لائے ہیں۔ قیامت ڈھانا، قیامت بپا کرنا وغیرہ تو اہل زبان کے مستعملہ ہیں مگر یہ نرالی ترکیب آج یگانہ ہی کے دہن مبارک سے سُنی۔ اور آگے چلیے۔ مصرعہ ثانی میں فرماتے ہیں — اب کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا — سر اٹھانا محاورے میں سرکشی و شرارت کے معانی میں مستعمل ہے تو گویا شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق صاحب اپنے پاؤں کی طاقت سے سر کچلنے کی زحمت شاقہ نہ برداشت فرمائیں کیونکہ اب باغیوں میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ سر اٹھائے۔ سبحان اللہ کیا تخیل ہے اور اسی پر ناز ہے۔

تیسرے شعر میں بوئے پیرہن کی یاد کی طرفہ طرازی بھی طرفہ ماجرا ہے۔ کیفیت بو کی یاد تو ممکن بھی ہے مگر یہ بو کی یاد نہ معلوم کس طرح آجاتی ہے پھر مصرعہ ثانی میں دماغ کی بیکاری کا اظہار اور بھی تماشا ہے یعنی بو اتنی روح افزا کیفیت ہے کہ آتے ہی دماغ کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ یگانہ کو یہ شعر کہتے وقت اس بو سے سابقہ ضرور پڑا ہے۔

شعر ۴ کے متعلق بجز اس کے کیا لکھا جائے کہ

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

غالب کے سب اشعار بلند پایہ ہیں خصوصیت کے ساتھ چوتھا شعر تو اس غضب کا ہے کہ یگانہ کی پوری غزل میں ایسا شعر نہیں نکلے گا۔

صفحہ ۱۲۲ یاد رکھو اہل کہ فطرت ہے سراپا انتقام شعلۂ سرکش بھی پامال ہوا ہو جائیگا (یگانہ)

دوسرا کوئی ہوتا تو — شعلۂ سرکش بھی ...... ہوا ہو جائیگا — کہکر سمجھ لیتا کہ شاعری کا حق ادا ہوگیا۔

میرزا مراد کی قوت سخن فہمی کا یوں تو کتاب بھر میں اندازہ ہوا ہے لیکن اس مقام پر جو نمونہ انھوں نے اپنی دماغی قابلیت کا پیش کیا ہے وہ بقول انھیں کے "قسم کھانے کے قابل" ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دوسرا کوئی پامال کا لفظ استعمال نہیں کرتا میں کہتا ہوں کہ ہر شخص پامال استعمال

میں لاتا۔ پامال بالکل سامنے کا لفظ ہے۔ پھر اسکے بغیر مصرعہ بھی پورا نہیں ہوتا ہے۔ شاید یگانہ یا مراد کی
نظریں پامال تک نہ پہونچتیں اگر مصرعہ پورا کرنے کے لیے اس کی حاجت نہ ہوتی۔

نکرہ ہر کس بقدر ہمت اوست

میں میرزا مراد کو مشورہ دوں گا کہ آئندہ وہ اس قسم کے مفروضوں سے احتراز کریں، ایک جگہ پیشتر بھی وہ
صفحہ نمبر ۱۰۲ پر اسی خام ذہنیت کا ثبوت دے چکے ہیں اور آگے چل کر بھی اکثر مقامات پر اسی قسم کے
لایعنی دعاوی قلم سے نکالے ہیں وہ اس سے پرہیز کریں تو بہتر ہے کیونکہ اس سے انکی صحت ذوق
اور وسعت مطالعہ کا بھرم کھلا جاتا ہے

صفحہ نمبر ۱۲۳ "عشق کا حسنِ طلب اک معنیِ بے لفظ ہے   گھگی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائے گا

کیا دیوان غالب سے جو بقول ایک اہل الرائے کے آسمانی صحیفہ ہے ایک شعر بھی ایسا پیش
کیا جا سکتا ہے جو اس شعر کا پاسنگ بھی ٹھہر سکے"

دیکھیے میرزا مراد صاحب، پھر آپ نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گرے، اجی حضرت آپ عجب جوجس
کا مرتبہ ہیں، خود ہی کئی جگہ فرما چکے ہیں کہ "معلوم نہیں غالب کے یہاں بھی ایسے نمونے ہیں یا نہیں"
جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی بدقسمتی سے اب تک دیوان غالب کا مطالعہ
نہیں کیا ہے اور پھر خود ہی مندرجۂ بالا عبارت تحریر کرتے ہیں۔ آخر آپ یگانہ کو بڑھانے اور
غالب کو گھٹانے کے جوش میں اس قدر وارفتہ کیوں ہو گئے ہیں کہ آپ کو اپنا پچھلا لکھا ہوا بھی یاد
نہیں رہتا۔ سچ ہے۔ دروغگو را حافظہ نباشد۔ جناب میرزا صاحب، ایک تو ایک غالب
کے یہاں سے ایسے سیکڑوں اشعار نکلیں گے۔ دو ایک میں ملاحظہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

۱- وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
۲- نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی   کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے
۳- اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
۴- نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں   جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

} غالب

شعر ۲ میں خط کشیدہ ترکیب معنیِ بے لفظ کی ترکیب کو گرد کیے دیتی ہے۔

صفحہ نمبر ۱۲۴ پر میرزا مراد ایک اور رنگ میں نظر آتے ہیں وہ پیشینگوئی کرتے ہیں کہ "اب دیوانِ
غالب میزان انصاف و خرد میں کلام یاس کے برابر نہیں تل سکتا"۔ کیوں میرزا صاحب یہ
رمالی کا پیشہ آپ نے کب سے اختیار کر لیا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس فن میں بھی آپ یگانۂ روزگار ہیں

ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا قسمت سے ہوں مجبور کہ ...... ملتی

آپ کا کہنا بالکل سچ ہے، کنکر پتھر کا ڈھیر لعل بدخشاں کے ساتھ کوئی بے وقوف بے عقل تولنے پر اُتر آئے تو کمیت میں یہ تودۂ بے حقیقت بیشک زیادہ رہیگا مگر کیفیت و قیمت میں بھی اس لعل شب چراغ سے کیا بڑھ سکتا ہے۔ رہی میزانِ انصاف درخرد تو بجز آپ اور آپ کے دوست یگانہ کے کسی اور کے پاس بھلا کیوں نکلے گی۔

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو گو خوشامد ہے بری چیز مگر کرتے ہیں

صفحہ ۱۲۸

کوئی طوفان آیا ہمارے کان بجتے ہیں ذرا اے بندگانِ ناخدا ہشیار رہ جانا (یگانہ)

حیرت ہے کہ میرزا یگانہ نے اس شعر پر جس اندیشہ ہولناک کا مرقع پیش کیا ہے اس پر غالب ایسے شخص کی نظر نہ پڑی۔"

یوں تو میرزا یگانہ کی شاعری مذاق لطیف کے لیے ایک ہولناکی ہی ہے مگر معلوم نہیں کہ موصوف نے اس شعر میں کون سی ہولناکی کا عجیب نقشہ کھینچا ہے جسکے مقابلہ میں غالب تک کے قدم نہیں جمتے۔ طوفان کا آنا بھی یقینی نہیں۔ ممکن ہے دماغ کی خشکی سے کان بجنے لگے ہوں مگر بندگانِ ناخدا کو ہشیاری کی دعوت پہلے سے پہلے ہی دے دی گئی۔ سبحان اللہ کیا پیش بندیاں ہیں۔ ابھی میرزا یگانہ صاحب یہ ناخدا کے بندوں کو فرزانگی و ہشیاری سے تعلق ہی کیا اور اپنی فکر میں آپ پڑنے کی ضرورت ہی کیوں۔ اسی پرواز تخئیل پر ناز ہے کہ میں جذبات کی صحیح تصاویر کھینچتا ہوں، اسی سرمایۂ قابلیت کے گھمنڈ پر غالب کے منہ آیا جا رہا ہے۔

کیا علم و اجتہاد ہے قربان جائیے

پھر جناب میرزا مراد صاحب کیا یہ لازمی ہے کہ ہر شاعر تمام ممکنہ مضامین کو نظم کرے، کیا یہ ضروری ہے کہ ہر استاد تمام دنیوی و دینی مسائل پر روشنی ڈالے۔ کیا ایک شخص اچھا شاعر نہ سمجھا جائے گا اگر اس کے ہاں چند ان موضوعات پر اشعار نہ نکلیں جن پر اور دوسرے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ کیا ایک سخنگو اساتذہ کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا اگر اس کے کلام میں ان مخصوص مباحث پر رائے زنی نہ ہو جن پر دیگر اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا کا کوئی شاعر شاعر نہ کہلاتا، کوئی استاد اُستاد نہیں رہتا۔ کیونکہ ہر شاعر کے کلام میں چند مضامین اس کے امتیازی ہوتے ہیں، ہر اُستاد کے دیوان میں چند اشعار اس کا طغرائے خاص ہوتے ہیں جو اُسکو

دوسرے شعراء سے ممیز کرتے ہیں جو اس کو دوسرے اساتذہ سے مختص کرتے ہیں۔

اسیر کا شعر ہے

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

کیا آتش نے اس موضوع پر کوئی شعر کہا ہے اور اگر نہیں کہا ہے تو کیا اس سے ان کی اُستادی پر حرف آتا ہے؟

امیر کا شعر ہے

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

کیا داغ نے اس مضمون کو کہیں باندھا ہے اور اگر نہیں باندھا ہے تو کیا اس بنا پر اسکی تنقیص کیجا سکتی ہے؟

عرفی کا شعر ہے

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی حدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

کیا حافظ نے اس مسئلے کو کہیں حل کیا ہے اور اگر نہیں کیا ہے تو کیا اس سے حافظ کے مرتبے میں فرق آجاتا ہے؟ آپ کی سمجھ میں اتنا نہیں آیا کہ اس قسم کا اعتراض کس قدر لغو ہوگا اس قسم کی تنقیص کس درجہ مہمل ہوگی، آپ خود اس طرح لوگوں پر ظاہر کیے دے رہے ہیں کہ آپ کا مقصد صرف غالب کی جا و بیجا تنقیص' اس کے کلام سے۔ بے ٹھکل تعریض ہی یگانہ یا کسی اور شاعر کے کلام سے منصفانہ تقابل نہیں۔

صفحہ ۱۳۶ پر یگانہ کی غزل ہے جس کی ردیف ہے — ہو جائے گا — اور قافیہ — مہرباں، بدگماں، وغیرہ — اسی زمین میں غالب کی غزل بھی موجود ہے۔ میں ہم قافیہ اشعار نقل کیے دیتا ہوں ارباب نظر خود فیصلہ کریں۔

	غالب	یگانہ
(۱)	لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر	سایۂ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر
	ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا	اُٹھ چلو ورنہ وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
(۲)	دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا	قالبِ خاکی کہاں تک ساتھ دیگا روح کا
	یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا	وقت آ جانے دو اک دن امتحاں ہو جائیگا
(۳)	سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا	یاس اس چرخِ زمانہ ساز کا کیا اعتبار
	مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا	مہرباں ہے آج کل نامہرباں ہو جائیگا
(۴)	گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط	چپکے چپکے ناصحا پھپھولے پھر رو لینے دے
	شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا	کچھ تو ظالم چارۂ دردِ نہاں ہو جائیگا

بجز پہلے شعر کے غالب کے تمام اشعار کے سامنے یگانہ کے شعروں کی کوئی ہستی نہیں اور پہلے شعر میں بھی غالب کچھ ایسا دبا ہوا نہیں ہے ۔ ان اشعار کے علاوہ ایک ایک شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

غالب [وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو ۔ اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

[چشم نامحرم کجا و جلوۂ محشر کجا ۔ پردۂ عصمت وہاں بھی درمیاں ہو جائیگا] یگانہ

غالب کی غزل کی جان اسکا مندرجۂ بالا شعر ہے ، اور یگانہ کے ہاں بھی مذکورۂ بالا شعر غزل بھر میں سب سے اچھا ہے ، بایں ہمہ یگانہ کے شعر کو غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں ۔ اصحاب فن دیکھ سکتے ہیں کہ دونوں میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا چاند اور جگنو میں ۔

صفحہ ۱۳۹

"ہوشیار اے چشم نرگس اے نگہبانِ بہار ۔ ہے زوالِ رنگ و بوست و گریبانِ بہار (یگانہ)

فدائیان غالب آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر جو چاہیں کہیں مگر چشم نرگس کو نگہبانِ بہار کہکر مصنف نے جو ندرت رنگیں بیانی دی ہے اس کی مثال غالب کا دیوان پیش نہیں کر سکتا ۔"

چشمِ نرگس کو نگہبانِ بہار ، پاسبانِ گلشن ، وغیرہ کہنا شعرائے مشرق کے یہاں اس قدر عام ہے کہ اس پر کسی شاعر کو اس کی رنگیں بیانی کی داد دینے لگنا بالکل خوشامد اور محض تحسین ناشناس ہے ۔ جناب میرزا مراد صاحب ، غالب تو بہت دور ہے اُس کا ایک غلام جو اُس پر اور اُس کی شاعری دونوں پر جان دیتا ہے ، مدتیں ہوئیں نرگس کو گلستاں کا "نگہباں" باندھ چکا ہے

رفتہ رفتہ یہ رہ گلشنِ امکان ہوئی ۔ صانعِ گل کی طبیعت بھی پریشان ہوئی ۔ اتنی بینائی سوسن سے پشیمان ہوئی

آنکھ نرگس کی گلستاں کی نگہبان ہوئی ۔ (تسنیم مینائی)

رہا سوال غالب کے یہاں سے اس ..... بقول آپ کے "رنگیں بیانی" کی مثال پیش کرنے کا ، تو یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے

(۱) سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی ۔ بن گیا روئے آب پر کائی ۔ (۲) سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے ۔ چشمِ نرگس کو دی ہے ...

(۳) چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو ۔ موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

(۴) لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل ۔ تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

پہلے شعر کی نازک خیالی ، دوسرے کی رنگینی ، اور بلند خیالی ، تیسرے کی بے مثل ترکیب "باغبانی صحرا" کیا جناب میرزا مراد صاحب ، آپ یگانہ کے کلام سے ان سب کا جواب پیدا کر سکتے ہیں ۔

معاذ اللہ من شرور انفسک

صفحہ ۱۴۱

پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مارے تنگ ہے آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زندان بہار (یگانہ)

کیا فرطِ مسرت کی ایسی نادر تصویر غالب کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہے۔"

جناب مراد صاحب، غالب کے کلام سے فرطِ مسرت کی ایسی تصویر تو نہیں پیش کی جا سکتی کیونکہ وہ اس قسم کے سارنے کے بے مغز مضامین نظم کرنا اپنی سبکی سمجھتا تھا۔ یگانہ کے لیے جو کچھ "فخر گفتار" ہے وہ اس کے لیے "ننگ" تھا البتہ اس سے ہزار درجہ بہتر، اس سے لکھو کھا درجہ رنگین تر، اس سے کروڑہا درجہ بلند تر، تصویر فرطِ مسرت میں اس کے کلام سے پیش کرتا ہوں غور سے سنیے۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں (غالب)

اب بھی اگر کوئی غلط فہمی آپ کو باقی رہی ہو تو آپ کی کم ذوقی اور کوتاہ بینی ہے۔

صفحہ ۱۴۳ پر پھر میرزا مراد بیگ اپنی کوتاہ ذہنیت کا ثبوت اس طرح پیش کرتے ہیں کہ "کوئی اور ہوتا تو مارا کی جگہ لوٹا کہہ دیتا"

قافلے کا قافلہ مارا ہوا رہزن نے رہ گئے سوتے کے سوتے سب جہانانِ بہار (یگانہ)

حالانکہ پچاس برس پیشتر امیر مینائی کہہ گئے ہیں

قاصد کو میرے قتل کیا نامہ دیکھ کر مارا پڑا غریب ہمارے گناہ میں (امیر مینائی)

صفحہ ۱۴۴ "انشاء اللہ ایک نہ ایک دن ثابت ہو جائے گا کہ آیات وجدانی کے سامنے غالب کی اردو شاعری کیا وزن رکھتی ہے"

آمین ثم آمین۔ میرزا صاحب خدا ایسا کرے کہ آپ کی یہ پیشنگوئی پوری ہو اور لوگوں پر آپ کی کذب بافیوں کا تار و پود کھل جائے۔ آپ گھبرائیے نہیں، کچھ آثار ایسے ہی ہیں کہ جلد آپ کی تمنا پوری ہوگی۔

بہ مکر و حیلہ خزاں را بہار نتواں کرد

صفحہ ۱۴۷ "میر و غالب کی غزلیں بھی اسی بحر میں ملاحظہ ہوں کثرت مضامین تازہ اور فصاحت و بلاغت کی معجز نمائی جو اس غزل میں ہے کہیں نہ پاؤ گے۔"

میرزا مراد تیر بیچارے کو تو اس لیے سامنے ہیں کہ لوگوں پر یہ نہ ظاہر ہو کہ انکو غالب ہی سے قلبی بغض ہے اصل مطلب ان کا یہی ہے کہ یگانہ کی غزل کا غالب کی غزل سے مقابلہ کر کے جس طرح بھی بنے یہ کہہ دیا جائے کہ یگانہ کی غزل کو ترجیح ہے۔ خوشامد ہو تو ایسی ہو۔

پاؤں پر سر بھی رکھا ہاتھ بھی جوڑے میں نے — کیا رہی اب بھی کوئی اور خوشامد باقی

لیکن ناظرین خود دیکھ لیں گے کہ غالب اور یگانہ کا مقابلہ ہی کیا، یگانہ کو غالب کے آفتابِ کمال کے ساتھ ایک ذرۂ حقیر کی بھی نسبت نہیں، بلکہ بقول میرے ایک دوست کے، اتنا کہنا بھی حقیقت میں یگانہ کے دماغ کو چڑھا دینا ہے۔ اللہ اس سے ہر اہلِ یقین کو دور ہی رکھے۔ مگر میں میرزا مراد کے خاطر غالب کے چند شعر لکھتا ہوں۔ دیکھنے والے دیکھیں کہ کون قافیہ کس نے بہتر نبھایا ہے اور مجموعی طور پر غزل کس کی برتر ہے کیونکہ ع ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔

غالب
کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

یگانہ
جھلاتے ہیں وہ سایۂ خورشیدِ حشر میں
عاشق کو اپنے تشنۂ دیدار دیکھ کر

غالب کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قسم کھانے کے قابل ہے۔ شعر مطلع ہونے کے ساتھ ساتھ مقامِ اعلیٰ اور اس درجہ معمورۂ معانی ہے کہ اس کے سامنے یگانہ کا شعر پڑھنا محض منہ چڑانا ہے۔

غالب
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

یگانہ
جنسِ وفا نہ بھی کوئی مفلس کا مال تھا
دل ہٹ گیا نگاہِ خریدار دیکھ کر

یگانہ کا شعر ممکن ہے کچھ اچھا ہو مگر گستاخی ہے اگر یہ بھی کہوں کہ غالب کے شعر کا مقابل کہاں؟ اتنا ادب آموز اور ادبی (Classical) شعر شاید یگانہ کے سرمایۂ شاعری میں بھی نہ نکلے۔

غالب
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

یگانہ
غیرت سرائے دہر سے منہ موڑنا پڑا
آنکھوں کو اپنی درپئے آزار دیکھ کر

حق یہ ہے کہ غالب کے کسی شعر کو یگانہ کا شعر نہیں پہنچتا۔ خصوصاً دوسرے شعر کا صحیح تغزل جس قدر بلند ہے وہاں تک یگانہ کی رسائی نہیں۔

غالب
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یگانہ
کس کل پہ ہے بنائے طلسماتِ آب و گل
اہلِ نظر ہیں نقش بہ دیوار دیکھ کر

یگانہ کے شعر میں سب سے پہلے مجھے "کس کل پہ" کی ترکیب پر اعتراض ہے۔ میں نے آج تک کہیں اس ترکیب کو استعمال ہوتے نہیں دیکھا ممکن ہے کسی استاد نے استعمال کیا ہو مگر یہ عام نہیں۔ اس سبب "طلسماتِ آب گل کی بابت یہ کہنا کہ "کس کل" پہ ہے کم سے کم غیر فصیح ضرور ہے اگر غیر صحیح نہیں۔ اس نقص کے سوا بھی شعر میں

کوئی خاص جدت یا کوئی مخصوص ندرت نہیں، برخلاف اس کے غالب کے شعر میں جو صحیح رنگِ تغزل نمایاں ہے وہ اس میں کہاں

غالب
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

یگانہ
پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
منزل کو اپنی زیرِ قدم جانتے ہیں ہم
اس توسنِ خیال کی رفتار دیکھ کر

یگانہ کے پہلے شعر کے متعلق میرزا مراد کی رائے ہے کہ "دنیا کا کوئی ادب اس کا جواب شاید پیش کر سکے" حالانکہ اصل یہ ہے کہ اس قدر پامال اور فرسودہ مضمون، اتنی اصلیت سے دور تخئیل، شاید کمتر سے کمتر شاعر کے یہاں بھی نہ نکلے گی۔ یگانہ کے دوسرے شعر کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ "رفتارِ خیال کے مسئلے پر فلسفہ اور سائنس کی کتابوں پر اس شعر کا اجمالی لطف بھاری ہے"۔ پہلے تو آپ ان دونوں تعریفی جملوں کی صحت پر غور فرما کر تھوڑی دیر ہنسیے، پھر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ یگانہ کے دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو بھی غالب کے شعر سے دُور پاس کی بھی کوئی نسبت ہے۔

ان شعروں کے علاوہ ذیل کے اشعار بھی دونوں کی غزلوں میں ہیں گو ہم قافیہ نہیں:-

	غالب	یگانہ
(۱)	گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر	شانہ ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے
	دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر	محوِ طلسمِ ہندیِ اسرار دیکھ کر
(۲)	ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں	ہنستا ہے مجھ کو عشق گرانبار دیکھ کر
	جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر	زنداں آب و گل میں گرفتار دیکھ کر
(۳)	زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال	باقی نہیں مزاج دوا کا اثر ہو گیا
	رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر	منہ پھیر لیتے ہیں ترے بیمار دیکھ کر
(۴)	آتش پرست سمجھے ہیں اہلِ جہاں مجھے	ناگفتنی ہے حضرتِ دل کونسی وہ بات
	سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر	کچھ یاد آ گیا رسن و دار دیکھ کر۔

یگانہ اور غالب کے اشعار میں جو فرق ہے اہلِ ذوق اس کا خود اندازہ فرمالیں گے۔

صفحہ ۵۶: "آنکھیں دکھاتے ہیں خرابِ چشمِ ہوس کو بار بار   محوِ طلسمِ ہندیِ نقش و نگار دیکھ کر

دنیا کی ناپائداری پر غالب نے خوب زورِ قلم دکھائے ہیں مگر معنوی خوبیوں کو اس روشن بیانی۔

کے ساتھ ادا کرنا اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔"

جناب میرزا امراد صاحب، غالب کے اوجِ زورِ قلم تو دور رہے صرف اس ایک شعر کو دیکھ لیجیے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے (غالب)

غالب اور یگانہ کے اشعار میں جو نازک فرق ہے اُس کو صرف باریک بیں اور حسن آشنا نگاہیں محسوس کر سکتی ہیں۔ اس فرق مراتب کے مزے صرف دل لوٹ سکتا ہے۔ صفحۂ کاغذ پہ اُسکا اظہار بہت دشوار ہے لیکن اس فرق کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ غالب کے شعر کا دوسرا مصرعہ جتنی سرعت اور آسانی سے زبان زدِ عوام، اور جزوِ عبارت ہو جانے کی اہلیت رکھتا ہے وہ اہلیت یگانہ کے شعر کے دونوں مصرعوں سے معدوم ہے۔ اصل میں غالب کا شعر آمد ہے اور یگانہ کا آورد۔ اسی بنا پر غالب کے شعر کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ یگانہ کے شعر کو نہیں۔

صفحہ ۱۵۸ آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے — سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزلِ یار دیکھ کر (یگانہ)

اس شعر کی ستایش میں بھی میرزا امراد نے پھر غالب پر چوٹ کی ہے، اگرچہ انکی ان چوٹوں کے دنداں شکن جوابوں کے ناظرین اب اس قدر عادی ہو گئے ہوں گے کہ اس شعر کے مقابلے کا شعر غالب کے یہاں سے ڈھونڈھ کر نکالنا امرِ فضول ہے۔ لیکن میرزا یگانہ سے معافی مانگ کر میں یہ عرض کرنے کی جرأت ضرور کرتا ہوں کہ اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں اگر بجائے "پھر آنکھ سے نہ کچھ" کے —— "نہ کچھ بھی خار و خس" —— ہوتا تو شعر زیادہ پسند ہو جاتا یعنی دوسرا مصرعہ یوں کر دیا جاتا

سوجھا نہ کچھ بھی خار و خس منزلِ یار دیکھ کر

اس طرح کانٹوں کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں "خار و خس" ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں سوجھنا آنکھ ہی سے ہے کان سے کسی شخص کو دکھائی نہیں دے سکتا، اس لیے یگانہ کے مصرعۂ اولیٰ میں آنکھ کا لفظ جو بھرتی کا ہے نکل جانا چاہیئے اور وہ اس تبدیلی سے نکل جاتا ہے۔ مجھے شاعری کا دعویٰ نہیں اور نہ استادی کا غرہ ہے، نہ میں نے یہ تبدیلی اصلاح دینے کی غرض سے پیش کی ہے بلکہ محض ایک رائے دی ہے اصحابِ فن اس کے بہتر نقاد ہو سکتے ہیں کہ کون بہتر ہے، میرا ترمیم شدہ مصرعہ یا یگانہ کا اصلی مصرعہ۔

صفحہ ۱۵۹

بتاؤ ایسے بندے پر ہنسی آئے کہ غش آئے — دعا مانگے مصیبت میں جو قصداً مبتلا ہو کر (یگانہ)

یگانہ کے اس شعر کے ساتھ میرزا امراد غالب کے اس شعر کا تقابل کرتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ناظرین خود غور فرمالیں کہ دونوں اشعار میں کسی قسم کی بھی کوئی مناسبت ہے اور باوجود اسکے میرزا امراد نے دونوں شعروں کو آمنے سامنے لاکر رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا امراد "تُک بے تُک، جو کچھ منھ میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں سمجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ بعد ازاں میرزا امراد مندرجۂ بالا شعر کی بنا پر غالب پر یہ الزام قائم کرتے ہیں کہ اس نے خدا سے گستاخی کی ہے۔ عقل قاصر ہے کہ آخر غالب کے شعر میں کس پہلو سے خدا سے گستاخی کی گئی ہے۔ ایک نیازمندانہ بندگی کے ساتھ اپنی زبوں حالی کی شکایت ہے اور بس۔ لیکن اب آئیے میں آپ کی تسکین کے لیے یگانہ کے کلام سے ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن میں خدا سے صریحی گستاخی کی گئی ہے۔

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا (یگانہ)

کیا اس شعر میں خدا سے گستاخی کا پہلو نہیں نکلتا ہے یعنی دنیا تو مقصود بالذات ہے اور دین کے کاروبار بیگار۔ اس لیے اُس قوت مقتدرہ نے کتنی بڑی غلطی کی کہ انسان کو جانور سمجھ لیا اور اس فضول بیگار کو انسان کے سر منڈھ دیا۔ اعوذ باللہ من ہذا الفتن۔ میرزا جی کیا اس سے زیادہ بھی گستاخی و بے ادبی کا نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے؟

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں (یگانہ)

کیا اس شعر میں خدا پر اور اس کے صریحی احکام پر اعتراض نہیں ہے۔

صفحہ ۱۶۰

آنکھ والے راہ میں حیرت کے پتلے بن گئے کچھ نہ سوجھا خاک کے پتلوں کا عالم دیکھ کر (یگانہ)

اس شعر کے متعلق میرزا امراد لکھتے ہیں:۔

"دیکھو غالب کے بعد اردو شاعری ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی کہاں سے کہاں تک پہونچ چکی ہے۔ ایک ایک لفظ میں دنیا سے معانی نظر آتی ہے۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں کون سے ارتقائی نمونے مضمر ہیں۔ ممکن ہے میرزا امراد نے "ارتقاء شاعری" کا کوئی نیا نظریہ اسی طرح دریافت کیا ہو جس طرح ڈارون نے "ارتقائے انسانی" کا کیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو نکڑی حضرت ظریف لکھنوی کو اکبر مرحوم کے بجائے اس نظریہ پر کچھ کہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

صفحہ ۱۶۴

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے پہنچتے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر (یگانہ)

ان اشعار کے متعلق میرزا امراد ارشاد فرماتے ہیں "ایشیائی شاعری میں انکا جواب نہ نکلے گا اور خصوصاً غالب کے یہاں" (یہ آخری حصہ اس جملے کا تو میرزا امراد کا تکیہ کلام ہو گیا ہے اور ہونا بھی چاہیے ورنہ غالب سے بغض کس طرح ظاہر ہو گا) - جناب میرزا صاحب، غالب تو پھر غالب ہے اور ایشیائی شاعری میں فارسی، عربی، چینی، سنسکرت، ان تمام زبانوں کی شاعری شامل ہے، میں اُردو کے ایک شاعر جگر مرادآبادی کے دو شعر انھیں قافیوں میں پیش کرتا ہوں، ذرا انصاف سے دیکھیے کہ کس درجہ صحیح تغزل میں ڈوبے ہوئے اور کس قدر سحر کُن اور مترنم اشعار ہیں۔

ترے جلووں میں گم ہو کر خودی سے بےخبر ہو کر | تمنا ہے کہ رہ جاؤں سراپا نظر ہو کر | (جگر مرادآبادی)
پڑا رہ سبزۂ بیگانہ پر تو صورت شبنم | نگاہِ شوق اُڑا لے جائیگی خود بال و پر ہو کر |

صفحہ ۱۶۷ پر اسے دردکی کوئی نگہبانی کرے کب تک | حقیقت کھل نہ جائے اضطراب رازداں ہو کر | (یگانہ)

" یہ وہ مقامات شاعری ہیں جہاں غالب کا گزر نہیں "

میرزا امراد صاحب، میں آپ کو کہاں تک فلسفۂ شاعری پر لکچر دوں اور کب تک غالب کے خلاف آپ کی زہر افشانیوں کو سنوں۔ یہاں صرف اتنا ملاحظہ فرمالیجیے کہ اسی غالب بیچارے نے بھی ایک جگہ رازداں کا قافیہ باندھ کر اپنے فلسفۂ رازدانی کا اعلان کیا ہے

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو | نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو | (غالب)

کیا اس فلسفہ اور اس تخیل کے سامنے یگانہ کا فلسفۂ رازدانی کوئی وقعت و رفعت رکھتا ہے۔ علاوہ بریں غالب کا شعر کس قدر رواں، کس درجہ صاف اور بقول آپ کے خالص اُردو کی سانچے میں ڈوبا ہوا ہے۔

صفحہ ۱۶۹ سے میرزا یگانہ کی ایک غزل شروع ہوتی ہے — دامن پہ، دشمن پر — اب اسے اتفاق سمجھیے یا یہ کہ میرزا یگانہ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ غالب کے باندھے ہوئے قافیوں پر طبع آزمائی کرتے - بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزل میں غالب کے ہم قافیہ کوئی شعر نہیں، مگر باوجود اسکے بھی میرزا امراد کا اصرار ہے اس لیے میں چند اشعار کا تقابل کرتا ہوں۔ یگانہ کے بہترین اشعار یہ ہیں۔

(۱) نہ ترک اختیار آساں نہ ضبط اضطرار آساں | یہی دستور دنیا چھلا کے اُٹھ جانا تھا دشمن پر | (یگانہ)
(۲) خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا | گرفتار قفس پر یا گرفتار نشیمن پر |
(۳) پسینا تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا | ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر |

(۴) فریبِ چشمِ احول سے ہوئی نی ہوئی دل کی | گرگیا دسترس دنیا کے زنگار نگ خرمن پر

غالب کے چار منتخب اشعار حسب ذیل ہیں :۔

(۱) فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے | متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
(۲) فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا | فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
(۳) ہم اور وہ بے سببِ رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے | شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
(۴) اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے | تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

غالب

غالب کا ہر شعر یگانہ کے ہر شعر سے بہتر ہے، غالب نے جن فلسفوں کو پیش کیا ہے اور جن نادر اندازوں سے ان تک یگانہ کی تنگ نظریں پہونچنے سے قاصر رہی ہیں۔ یگانہ کے ہاں سب سے بہتر دوسرا شعر ہے، غالب کا دوسرا شعر بھی ناظرین کے سامنے ہے، خود اندازہ کرلیں، کہ اس نے کس خوبی سے کتنے عظیم فلسفہ کی ترجمانی کی ہے۔ غالب کا چوتھا شعر کس قدر بلند اور صحیح تغزل کا کتنا بھلا نمونہ ہے یگانہ کے بقیہ دونوں اشعار بہت معمولی ہیں۔

صفحہ ۱۸۴۔ "غالب کے اشعار کی طرح اگر تاویلات بارہ کی ضرورت پیش آئے تو پھر شاعری کیا ہوئی"

میرزا مراد کے اس لغو اعتراض کے سیکڑوں دنداں شکن جواب ہوسکتے ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ ان کا یہ اعتراض غالب پر بمقابلۂ یگانہ ہے میں صرف یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ یگانہ کے اشعار کے لیے کون کم تاویلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کُل کتاب آیاتِ وجدانی سے اسی امر کا اظہار ہوتا ہے اور میرزا مراد نے قریب قریب ہر ورق پر یگانہ کے اشعار کی تاویلیں کی ہیں اور ان کی توضیح و تشریح میں صفحے کے صفحے سیاہ کیے ہیں۔ غالب کے شعروں کے لیے جہاں تاویلات کی ضرورت پڑی بھی ہے وہاں بھی آٹھ آٹھ دس دس صفحوں میں تاویل نہیں کی گئی ہے۔

صفحہ ۱۸۶۔ پھر مراد صاحب اپنی بوکھلاہٹ کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں کہ یگانہ کے شعر ذیل

داورِ حشر ہوشیار دونوں میں امتیاز رکھ | بندۂ ناامید اور بندۂ بے نیاز میں (یگانہ)

کے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر لاکر رکھ دیتے ہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب | ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (غالب)

صفحہ ۱۹۷

عمر گھٹنے کے لیے تھی دنت کٹنے کے لیے | مفت دن گننے کو ہم پڑے گئے بیگار میں (یگانہ)

"زیست رائیگاں کا یہ فلسفہ میرزا غالب تو کیا عرفی و نظیری نے بھی شاید ہی بیان کیا ہو اور اس

خوبی کے ساتھ کہ بدمذاقی کی بو نہ آئے"

میرے خیال میں بیگار سے قافیہ کو نظم کرنا ہی بدمذاقی کی دلیل ہے اور پھر اتنے بھونڈے طریقے سے ایسے لایعنی تخییل کے ساتھ، اس قدر اصلیت سے دور مضمون کو لیکر ـــــ جن شعراء کا میرزا امراد نے ذکر کیا ہے وہ اس قسم کے اشعار کہنا اپنی ذلت اور توہین تصور کرتے تھے۔

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

صفحہ ۲۰۳۔ دنیا سے آس جانے کو جی چاہتا نہیں واللہ کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں (یگانہ)

کس قدر معمولی شعر ہے اور کتنا عام مضمون کس درجہ بے مزہ انداز سے بیان کیا گیا ہے، اور اس کی تعریف میں میرزا امراد رقمطراز ہیں:-

"یہ وہ شعر ہے جس پر اہل دل کے گریبان، اور غالب کے ایسے سیکڑوں دیوان پھٹتے ہیں"

معلوم نہیں میرزا امراد کو اب تک کے کُرتے اور کتنی قمیصیں پھاڑنے کی نوبت آئی کیونکہ خود کو اہل دل شمار کرانے میں وہ بہت پیش پیش ہیں۔

صفحہ ۲۱۹۔ موج ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو دنیا سے گرد باد کی نشو و نما نہ ہو (یگانہ)

"اتنی نازک اور گہری حقیقتیں اس آسانی اور برجستگی سے نظم کردینا کم از کم غالب کے لیے تو نہایت مشکل تھا۔"

ناظرین ملاحظہ فرمالیں کہ اس فقرے سے کس درجہ تنقیص کا پہلو نمایاں ہے اور میرزا امراد نے کتنے مہمل اور لایعنی طرز سے ایک مہمل تر اور لایعنی تر بات کہی ہے۔

صفحہ ۲۲۲۔ امید صلح کیا ہو کسی حق پسند سے پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو ہوگے بڑھا نہ ہو (یگانہ)

"کیا غالب کا دیوان اس (Original) فلسفہ صلح کی مثال پیش کرسکتا ہے"

یہاں پھر میرزا صاحب کی کوتاہ بینی اور بے مائیگی علم کا راز فاش ہوا جاتا ہے جیسا کہ میں اس سے پیشتر ایک جگہ عرض کر چکا ہوں یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر کے یہاں ہر مضمون پر اشعار ہوں، یہ کہنا تو ایسا ہی ہوگا گویا حضرت عیسیٰ سے ید بیضا مانگنا، اور حضرت موسیٰ سے دم مسیحا کی طلب، کیونکہ دونوں پیغمبر تھے اور دونوں ایک ایک معجزے کے مالک۔ غالب کے کلام سے یقیناً صلح کے فلسفہ پر کوئی شعر نہیں نکالا جاسکتا یا کم از کم مجھے نہیں ملا۔ بہر حال مل سکتا ہو یا نہ مل سکتا ہو۔ میرزا امراد کے اعتراض کا جواب تو یہ ہوگا کہ کیا یگانہ کے کلام سے اس فلسفہ رونق مکاں کا جواب مل سکتا ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی (غالب)

صفحہ ۲۳۲

"دل دیوانہ مجھ کو کس بلا کے بن میں لے آیا ... اسی میں خیر ہے پھر لے چل اُلٹے پاؤں زنداں کو (یگانہ)

اسی کیفیت کو ایک جگہ میرزا غالب نے کمال سادگی کے ساتھ نظم بند کیا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ... دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالب)

مگر گستاخی معاف دونوں اشعار میں زمین و آسمان کا فرق ہے"

یعنی قصہ مختصر یہ کہ یگانہ کا شعر غالب کے شعر سے بہتر ہے - اہل نظر دیکھ لیں کہ اس تصفیہ مرادی میں منفعت مزاجی کو کہاں تک دخل ہے - غالب کے شعر کی سادگی ہی وہ حسن ہے جسکے سامنے یگانہ کے شعر کے سارے حسن (اگر ہوں) ہیچ ہیں - یگانہ کے شعر میں باوجود بلندی تخیل جو خشکی ہے اور دوسرے مصرعہ میں جو کرختگی اور انداز بیان کی پستی ہیں وہ سب اسکو اچھے اشعار کے زمرے سے خارج کیے دیتی ہیں چہ جائیکہ غالب کا شعر جو حسنِ بیان، کمال سادگی اور علوئے تخیل کا شاہکار ہے' میرزا مراد کے اشاروں سے جو مطالب غالب کے مندرجہ بالا شعر کا مترشح ہوتا ہے وہ اصلیت سے اس قدر دور ہے کہ ان کا تقابل کرنے میں وقت کا کھا جانا کچھ بیجا نہیں معلوم ہوتا - صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف صحیح مطلب ہی نہیں سمجھے ہیں بلکہ بالکل اُلٹا مطلب سمجھ رہے ہیں - مگر رونا تو اسی کا ہے کہ جب وہ اشعار کے صحیح مطالب نہیں سمجھ سکتے تو ان کو اس خامہ فرسائی کی ضرورت ہی کیا ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ جو کچھ جی میں آتا ہے قلم اُٹھا کر لکھ مارتے ہیں

چیزے کہ نخواندۂ تو تفسیر مکن

صفحہ ۲۳۲ رہیگی چار دیوار عناصر درمیاں کبتک ... اُٹھیگا زلزلہ اکدن اسی بیٹھے ہوئے دل سے (یگانہ)

"اسی فلسفے کو غالب نے بھی بیان کیا ہے مگر کس بھونڈے طریقے سے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ... ہیولا برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا (غالب)

غالب کا شعر نرا خشک فلسفہ ہو کر رہ گیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ جنگل سے لا کر کھوڑے میں بند کر دیے گئے ہیں"

یگانہ کے شعر کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ عناصر کی چار دیواری یعنی جسم کا پردہ کب تک حائل رہ کر اس زلزلے یا طوفان کو روکے رکھے گا جو ایک نہ ایک دن دل سے اُٹھنے والا ہے ـــــ شعر میں دو خوبیاں ہیں' ایک تو معنوی جو مطلب سے واضح ہے دوسری ظاہری ـــــ اُٹھے گا زلزلہ اک دن اسی بیٹھے ہوئے دل سے ـــــ غالب کے شعر کا مطلب بیان کرنے کی مجھے حاجت نہیں

وہ اس قدر عام اور مقبول عوام ہے کہ قریب قریب تمام دیکھنے والوں کے ذہن میں اس کا مطلب موجود ہوگا۔ اب سوال دو پیدا ہوتے ہیں اول تو یہ کہ بیشک فلسفہ کیا چیز ہے؟ (کیا کوئی ترنا فلسفہ بھی ہوتا ہے؟) اور اس لفظ کا اطلاق میرزا مراد غالب کے شعر پر کیوں کر رہے ہیں۔ غالب کے پہلے مصرعہ میں (ابھی دوسرے کو رہنے دیجیے) وہ ظاہری خوبیاں ہیں جو یگانہ کے دوسرے مصرعہ کی ایک ظاہری خوبی کے واسطے بطلان کلی سے زیادہ کام کرتی ہیں'

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

تعمیر کی مناسبت سے خرابی اور مضمر کی نسبت سے صورت' ——— اس کے علاوہ پورا مصرعہ جس فلسفہ کا حامل ہے اور جس پہلو سے اسے بیان کرتا ہے کیا یگانہ کا پورے کا پورا شعر بھی اس فلسفہ کا حامل ہے، کیا یگانہ کے شعر بھر میں وہی فلسفہ اتنی جامعیت سے بیان ہوا ہے۔

اب آئیے غالب کے دوسرے مصرعہ سے بحث و تمحیص کیجیے ——— ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا ——— میں نے اکثر اصحاب (جن میں میرزا مراد بیگ شیرازی بھی شامل معلوم ہوتے ہیں) کی زبانی سنا ہے کہ اصل میں اعتراض غالب کے کل شعر پر نہیں ہے صرف اس مصرعہ پر ہے کہ یہ اس قدر گنجلک اور تغزل سے اس درجہ دور ہے کہ نہ دل اس کے مزے اٹھا سکتا ہے نہ عقل اس کے معانی سے بآسانی بہرہ اندوز ہو سکتی ہے ——— میں یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ دل اسکے مزے نہیں اٹھا سکتا لیکن میں یہ قبول کرتا ہوں کہ عقل اس کے معانی سے بسہولت مستفید نہیں ہوتی۔ بہرحال خواہ اس کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آئے یا دشواری سے۔ جب سمجھ میں آ جائے تو دیکھیے کہ جس فلسفہ کو غالب نے کل شعر میں بیان کیا ہے اور جس کا ثبوت اس نے خصوصاً دوسرے مصرعہ سے دیا ہے وہ صرف یگانہ کے شعر ہی سے برتر نہیں بلکہ اپنی جگہ پر اتنا نرالا اور اس قدر عجیب ہے کہ شاید ہی کسی اور زبان کے ادب میں اس مطلب کا شعر ملے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا واقعی غالب کے شعر میں الفاظ اتنے کرخت' اور عبارت اس قدر "سماعت پر گراں" ہونے والی ہے کہ ان پر جنگل سے پکڑ کر لائے جانے کا اطلاق کیا جا سکے۔ میں اس قدر سخت نظریہ تو اس شعر کی بابت قطعاً نہیں رکھتا ہوں لیکن یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ غالب کے دوسرے مصرعہ میں ترنم کا فقدان ہے، مگر گستاخی معاف، کیا کسی شاعر کے ایک آدھ یا دس پانچ اشعار میں ترنم نہ ہونے کی بنا پر اسے دیوزاد زبان کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ پھر کیا اردو کے تمام شعراء کے کلام میں، فارسی کے تمام اساتذہ کے یہاں، ایسے اشعار نہ نکلیں گے جن میں ترنم

غیرموجود ہو، شعریت کا فقدان ہو۔ کیا یگانہ کے تمام اشعار اس سقم سے پاک ہیں اس نوع کے عیب سے بری ہیں۔

صفحہ ۱۷۱۔ زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہوکر — عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہوکر
صفحہ ۲۱۳۔ بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جیب تو کیا کرتے — اُتاریں بیڑیاں اور پہنے ڈہرے طوقِ گردن میں — یگانہ

کیا مندرجہ بالا شعروں میں کرختگی اور درندگی نہیں ہے۔ علاوہ بریں یگانہ کے شعر زیرِ بحث ہی میں کون سا خاص ترنم یا مخصوص شعریت ہے۔ اور میرے خیال میں تو یہ فخر کہ انکے زیادہ تر شعر شعریت میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے اب تک اردو کے صرف چار شعراء کو حاصل ہے۔ انیس، آتش، داغ، جگر مرادآبادی۔ ورنہ یوں تو ہر شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ جزو شعریت کا ضرور ہوتا ہے۔

صفحہ ۲۲۶ " نہ معلوم غالب کے ہاں ایسی کتنی غزلیں ہیں جن میں کثرتِ مضامین کے ساتھ زورِ قلم اول تا آخر یکساں رہا ہو۔"

جناب مرزا صاحب، غالب ہی اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جسکے دیوان میں مشکل سے چند غزلیں ایسی نکلیں گی جو آغاز سے انجام تک خوب نہ ہوں۔ اس کی غزلوں میں عموماً مطلع سے لیکر مقطع تک وہی زورِ بیان، وہی علوئے تخیل، وہی تیور، اور وہی دلکشی رہتی ہے۔ اگر یگانہ کے ہاں ایسے بیسیوں نمونے موجود ہیں (جس میں مجھے شک ہے) تو غالب کے ہاں سیکڑوں نمونے ایسے ملیں گے۔ آپ کی تنبیہ کی خاطر صرف (ا) کی ردیف سے میں دس بارہ مطلعے لکھے دیتا ہوں۔ خدا توفیق دے تو ان مطلعوں کی غزلیں پڑھیے میرے بیان کی بخوبی تصدیق ہو جائے گی :-

۱۔ کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا
۲۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
۳۔ دوستِ غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
۴۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
۵۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
۶۔ درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
۷۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
۸۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
۹۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۱۰۔ ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

۱۱۔ تو مری چین جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

۱۲۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

صفحہ ۲۶۱

جلوۂ بے رنگ تھا پردہ کے اندر کچھ نہ تھا — حق سجانب تھا جو اندیشہ تھا محل سے مجھے (یگانہ)

"مجھے اپنی کوتاہ نظری کا اقرار ہے کہ میں دیوانِ غالب سے جلوۂ بے رنگ کا جواب نہیں پیش کر سکتا۔"

الحمدللہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرزا امراد نے ایک جگہ تو اس کا اعتراف کیا کہ وہ کوتاہ نظر ہیں۔ جناب مراد صاحب غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار پڑھ لیجیے' جلوۂ بے رنگ کے مقابلہ کی ترکیبیں مل جائیں گی۔ اور ایسے ہزاروں نمونے اس کے کلام میں موجود ہیں۔

نے گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز (غالب)
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

صفحہ ۲۶۴۔ غالب نے بھول بھلیاں میں ڈال رکھا تھا — ہم اُن کو ڈھونڈھتے یا اپنی جستجو کرتے (یگانہ)

"غالب بھول بھلیاں کے لفظ سے ناآشنا نہ تھے مگر کیا وہ یہ لفظ اس مفہوم کے اظہار کے لیے لا سکتے تھے"

یہاں پھر میرزا امراد نے اپنی مخصوص ذہنیت کا ثبوت دیا۔ یگانہ نے "بھول بھلیاں" کا لفظ کیا استعمال کر لیا کہ غالب کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ وہ یہ لفظ استعمال کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ مجھے تعجب اس پر ہے کہ یگانہ اُن الفاظ کو استعمال ہی کیوں کرتے ہیں جن کو غالب نے بھی استعمال کیا ہے۔ انھیں تو صرف اُن الفاظ میں اشعار کہنے چاہییں جو غالب کلام میں نہیں لایا تھا۔

صفحہ ۲۶۶ "تابِ نگاہ کی نہیں آنکھوں سے چشمداشت — کیا لو لگائیں جلوۂ دیدار یار سے" (یگانہ)

"غالب نے بھی اسی مفہوم کو کئی طرح نظم کیا ہے مگر یہ الفاظ کسے نصیب ہوتے ہیں"

میرزا امراد کی آنکھوں پر جانبداری اور تعصب کا اتنا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے' کہ غالب کا اچھا شعر دیکھ کر بھی انھیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے شعر کو یگانہ کے شعر پر فوقیت ہے۔ یگانہ کے مندرجۂ بالا شعر میں "آنکھوں سے تابِ نگاہ کی چشمداشت نہیں" کے ٹکڑے کی لطافت نے اور "لو لگانے" کی بلاغت نے ان کو ایسا مسحور کیا ہے کہ غالب کے شعر (اسکے ایک نہیں کئی شعر اس موضوع پر ہیں) کی معنوی اور ادبی خوبیاں انھیں نظر ہی نہیں آتیں۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر	جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے	میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز	آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں مُنہ چھپائے کیوں
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے	طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

غالب

غالب کے پہلے دو شعروں میں اندازِ بیان، ندرتِ تخیل، اسلوب کی رنگینی پر صد ہزار گلستانِ معانی قربان ہیں۔ میرزا مراد "بہت شعریت اور موسیقیت میں ڈوبے ہوئے" اشعار کا گانا گاتے ہیں آئیں دیکھیں کہ غالب کے تیسرے شعر میں کس قدر ترنم ہے۔ پھر صرف ترنم ہی ترنم نہیں ہے معنوی خوبیاں بھی قسم کھانے کے قابل ہیں۔ کیا اتنے مکمل شعر کے مقابلہ کا شعر یگانہ کے سرمایۂ کلام سے پیش کر سکتے ہیں۔ غالب کا چوتھا شعر یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر کا بالکل ہم معنی ہے، اربابِ نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالب کے شعر کی معنویت کو یگانہ کا شعر پہونچتا ہے یا نہیں۔ علاوہ بریں غالب کے دوسرے مصرعہ کی بیساختگی اور پہلا مصرعہ لگانے کا حُسن، دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جن کا یگانہ کے شعر میں نام نہیں۔ پھر یگانہ نے "چشمداشت" کا لفظ استعمال کیا ہے جو نہ صرف اردو کے لیے غیر موزوں ہے بلکہ اردو داں دماغوں کے واسطے غیر مانوس بھی، حقیقت یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے غالب کا شعر ایسا ہے کہ یگانہ کے شعر کا اس سے مقابلہ کرنا غالب کے مرتبہ کی تنقیص ہے۔

صفحہ ۲۷۶ کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے — رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے (یگانہ)

اس شعر کی تعریف میں میرزا صاحب نے پھر زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اس میں جو عیب ہے اُس کا ذکر میں انشاء اللہ موقعہ پر کروں گا۔ فی الحال میں میرزا مراد کی توجہ غالب کے دیوان کے مطلع کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا (غالب)

اگر ان میں ذرا سی بھی منصف مزاجی ہے تو اُنھیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ غالب کے شعر نے جس حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے اور جس دلکش پیرایہ میں، وہ یگانہ کی رہنمائی سے کس درجہ بلند تر ہے۔ کاش میرزا مراد یہ دیکھ سکتے کہ ہندوستان کے اس الہامی شاعر نے اس شعر میں کن کن حقیقتوں کو پوشیدہ کر دیا ہے۔

صفحہ ۲۸۵ پر یگانہ کی غزل ہے — دکھاتا ہے مجھے، ڈراتا ہے مجھے —— ان کی اور میرزا مراد دونوں کی بدقسمتی سے غالب نے بھی اسی طرح میں غزل چھوڑی ہے اور میرزا مراد نے پھر اپنی منہ زوری سے ناظرین کی توجہ اس طرف منعطف کرائی ہے کہ یگانہ کی غزل کا غالب کی غزل سے مقابلہ کیا جائے۔

غالب:
باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

یگانہ:
دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

غالب کے اشعار سے یگانہ کے شعر کو کوئی نسبت نہیں۔ اس لیے مزید تفصیل بے سود ہے۔

غالب:
رہا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

یگانہ:
لب دریا کا ہوا ہیں نہ تہ دریا کا
ناخدا کون سے گھاٹ اب لیے جاتا ہے مجھے

سبحان اللہ۔ غالب کا شعر اس پایہ کا ہے کہ روح اس پر وجد کرتی ہے انداز بیان دلوں کو مسخر کیے لیتا ہے یہ شعر اردو ادب کے نایاب ترین موتیوں میں سے ایک موتی ہے جسکے ہر جلوے اس کی چمک دمک سے اس کی جامعیت، اس کی کاملیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہ گوہرِ آبدار ہے جس کی ضو جو اہر کے درمیان بھی نظارہ سوز رہے گی۔

غالب:
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

یگانہ:
ننگ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

میرزا مراد نے یگانہ کے شعر کو غالب کے شعر سے اس بنا پر اچھا تو کہہ دیا کہ یگانہ نے ننگ محفل کی سوزگری لاجواب کی ہے مگر یہ نہیں دیکھا کہ غالب کے شعر میں جو طنز، جو رنگ تغزل، نمایاں ہے اس کا جواب یگانہ کے ہاں نہیں ہے۔ پھر میرزا صاحب، یگانہ کے شعر میں جو ایک نقص ہے اسے نظرانداز کیے گئے رہے ہیں، ایسا نقص جو اتنا اہم ہے کہ کسی استاد کے اشعار میں نہ ہونا چاہیے۔ اس کا ذکر میں انشاء اللہ یگانہ کی شاعری کے بحث کے دوران میں کروں گا یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یگانہ کے شعر کو غالب کے شعر پر کوئی فوقیت نہیں ہے گو غالب کا یہ شعر بھی اس کے اور اشعار کے مقابلہ میں کم درجہ ہے۔

یگانہ کی غزل میں اور بھی کئی اشعار ہیں جن میں سب میں صرف قافیوں کی ٹھونس ٹھانس ہے۔ کوئی حسن و خوبی کسی میں نہیں، صرف الفاظ کے گورکھ دھندے اور مضحکہ خیز تخیل کے نمونے ہیں۔ مثلاً

یگانہ:
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے
جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے

یگانہ اور مراد، دونوں لکھنؤ کے شعرا پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے اشعار پھیکے اور بے مزہ ہوتے ہیں اور خود یگانہ کے اشعار کو نہیں دیکھتے کہ وہ پھیکے پن اور بے مزگی کی حد سے گزر کر سوقیانہ بھی ہو جاتے ہیں۔

میرے خیال میں یگانہ کے اور اشعار میں نسبتاً یہ شعر بہتر ہے

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندان بلا　　　شوقِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے (یگانہ)

غالب کی غزل میں صرف ایک شعر اور ہے

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم　　　ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے (غالب)

میرزا مراد سے اگر "جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم" کا جواب یگانہ کے کلام سے نکل سکے تو نکالیں - غالب کے شعر کی رفعت یگانہ کے شعر کو باوجود خوبیوں کے گرد کیے دے رہی ہے -

صفحہ ۲۹۳　جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا　　　مٹ کر بھی مری ہستی برباد رہیگی (یگانہ)

"غالب کی جدت طرازی ایک افسانہ ہی افسانہ ہے"

غالب کی قوتِ جدت طرازی پر تو اس سے کوئی حرف نہیں آتا - البتہ یگانہ کی جدت طرازی کے شہرے باطل ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ اس شعر میں جو جو خوبیاں ہیں وہ اُردو اور فارسی اساتذہ کے کلام میں پیشتر سے موجود ہیں -

برباد [بر-باد] کا حسن

(۱) بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است　　　بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است (حافظ شیرازیؒ)

(۲) آئے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے　　　خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے (امیر مینائیؒ)

یہ تخیل کہ خاک کا پتلا اور صحرا کا بگولا دونوں ایک ہی شے ہیں، یگانہ سے پیشتر کئی شعرا نظم کر چکے ہیں:

(۱) بعد مردن بھی مری گردشِ قسمت نہ گئی　　　خاک ہو کر بھی بگولا ہوں بیابانوں میں (حمد راسپوری)

(۲) مٹ کر بھی مری ہستیِ موہوم رہے گی　　　بستی نہ سہی دشت میں تو دھوم رہے گی (نامعلوم)

اس تعریض سے میرا یہ مطلب نہیں کہ یگانہ کا شعر اچھا نہیں ہے - مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ اس سے نہ تو غالب کی جدت طرازی افسانہ ہو جاتی ہے نہ یہ جدت طرازی [اگر اسے جدت طرازی کہا جا سکتا ہے] یگانہ سے منسوب کی جا سکتی ہے -

صفحہ ۲۹۵ - حسن آ دیدہ کجا اپنا ہی پردا کھل گیا　　　آسماں ثابت ہوا حدِ نظر میرے لیے (یگانہ)

"کیا غالب نے ایسے حقائق کو ان آسمانی الفاظ میں کبھی ادا کیا ہے"

اس کا جواب دینے کی سعی کرنا فضول ہے کیونکہ اعتراض لغو و فضول تر ہے -

باوجود کوشش کے آیات وجدانی کے اس پہلو سے بحث ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی - لیکن ناظرین پر خوب اچھی طرح واضح ہو گیا کہ میرزا مراد بیگ کے دل میں غالب کی کتنی وقعت ہے اور وہ

کس پیچ و تاب سے، کس کرب و اضطراب سے، جا و بیجا، جل جل کر، بھن بھن کر، غالب کو بُرا کہتے اور انکی شاعری کی تنقیص کرتے ہیں۔ اُن کو کہیں غالب کی کوئی خوبی، اُس کی شاعری میں کسی جا کوئی حسن، نظر نہیں آتا۔ اُن کو ہر جگہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ یگانہ نے غالب کے اشعار سے بہتر اشعار کہے ہیں۔ ہر صفحہ پر ان کے قلم سے یہی نکلتا ہے کہ یگانہ کی ترکیبیں غالب کی ترکیبوں سے اعلیٰ تر ہیں۔ غرض غالب سے تعریض اور اُس کے اشعار کی تنقیص ان کا مذہب ثانی ہو گیا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

(۷)

آیات وجدانی کی اشاعت کا تیسرا مقصد جو ضمنی ہے لکھنؤ کی شاعری اور اُسکے شعرا کی تنقیص و تذلیل ہے اور شعرا میں متقدمین و متاخرین، ماضی و حال، کسی کی تخصیص نہیں، موجودہ شعرا کی تو نام بنام تذلیل کی گئی ہے اور قدیم شاعروں کی ان کی شاعری کے پردے ہیں۔

یہ امر تو مسلم ہے [اور اگر مسلم امور بقول میرزا مراد اپنی مسلمیت کے تناسب سے لغو اور باطل نہیں ہوتے ہیں] کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ جن دو فریقوں میں تنازع ہوتا ہے وہ دونوں اس تنازعہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں، یا کم یا زیادہ، یہ نفس واقعہ پر منحصر ہے۔ بہر حال میرزا مراد بیگ کی دلدہی کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابتداء کے دو ایک جھگڑوں میں قصور سراسر اہل لکھنؤ ہی کا تھا تو بھی یگانہ کی کیسر بے گناہی، مکمل معصومیت [جس کے راگ کتاب بھر میں ہر جگہ گائے گئے ہیں] کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ عقل اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے، کہ شروع سے آخر تک، آغاز سے انجام تک تمام جھگڑوں کا الزام، سب تنازعات کی ذمہ داری شعرائے لکھنؤ کے سر ہو اور یگانہ بالکل معصوم ہوں، یکسر بےگناہ ہوں، سراسر بے خطا ہوں۔

جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں یگانہ نے غالب پر نکتہ چینی شروع کی اور خواجہ آتشؔ کو اپنی بیجا خود ستائیوں کی، بے ڈھنگی تعلیوں کی آڑ بنایا۔ سمجھے تھے کہ لکھنؤ والے آتش کے لکھنوی ہونے کی بنا پر غالب پر آتش کو ترجیح دینے میں ان کا ساتھ دیں گے، لیکن اُن کو کیا معلوم تھا کہ لکھنؤ والوں میں ابھی اتنی پاسداری اس قدر منصف مزاجی باقی ہے کہ وہ ہم وطنی کے جذبہ سے متاثر ہو کر حق کو باطل اور باطل کو حق کہنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ تب لکھنویوں نے اس بدنما طرز خود پرستی اور بے جا طریقۂ خودنمائی پر خبر لی تو یگانہ کو اُن سے بھی بغض ہو گیا، ورنہ آخر ان سے اس قلبی بغض اس بے وجہ عداوت کا کیا سبب تھا۔ کیا یگانہ کا یہ مطلب ہے کہ ان سے پیشتر اور انکے علاوہ کسی لائق بیرونی کو 'لکھنوی' کہلائے جانے کا فخر حاصل ہی

نہیں ہوا، متقدمین کو ابھی رہنے دیجیے، ان میں سے تو اکثر باہر کے تھے، موجودہ شعرا ہی کو لے لیجے، ان میں سے کتنے اس معیارِ لکھنویت پر پورے اُترتے ہیں جو یگانہ نے لکھنؤ والوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

عزیزؔ لکھنوی فخریہ کہتے ہیں ؎ فیض پہونچا ہے مجھے شیراز اور کشمیر سے۔

بیخودؔ اور اثرؔ دونوں موہان کے رہنے والے ہیں۔

جلیلؔ مانکپوری کو جلیل لکھنوی لکھا جاتا ہے ورنہ اصلیت یہ کہ وہ معیار لکھنویت پر پورے نہیں اُترتے۔

وصلؔ بلگرامی قصبۂ بلگرام کے متوطن ہیں اور نیاز فتحپوری فتحپور کے۔

غرض یہ کہ لکھنؤ کے موجودہ مشاہیر شعرا میں سے کئی باہر کے رہنے والے ہیں، آخر ان میں سے کسی کے ساتھ لکھنؤ والوں کو بغض کیوں نہیں ہو گیا، آپ ہی سے اس قدر گہری عداوت کی کیا وجہ ہوئی۔ میرے خیال میں اصلی سبب یہی تھا کہ آپ نے لی دُون کی اور لگے ایران و توران کی کھینچنے، اپنی شاعری کی صفت میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے۔ لکھنوی یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ آپ ان کے منہ پر غالب کی تضحیک و تذلیل کریں اور وہ خاموش رہیں، ان کی موجودگی میں آپ غالب کے کمالات کی توہین کریں اور وہ زبان سے کچھ نہ بولیں، اُنھوں نے بھی آپ کی خبر لی اور خوب اچھی طرح۔ کسی انگریز فلسفی کا قول ہے

[Every thing is fair in love and war (جنگ اور عشق میں ہر فعل جائز ہے)]

لکھنویوں نے اسی اصول پر عمل کیا۔ ان سے جس طرح بنا اُنھوں نے آپ کے باندھے ہوئے طلسموں کو توڑا اُن سے جس ذریعہ سے ممکن ہوا اُنھوں نے آپ کے دعاوی کو باطل کیا۔ آپ نے غالب اور آتش کا موازنہ کر کے غالب کی ہجو کی، لکھنویوں نے اس کا جواب آپ کی ہجو کہکر دیا، اور آپ تھے کہ اپنی باری آنے ہی رونے لگے، واویلا مچانے لگے۔ حضرت غالب کی تذلیل کرتے وقت، غالب کے لیے تذلیل آمیز عبارت لکھتے وقت، غالب کی شان میں گستاخیاں کرتے وقت آپ کو اسکا خیال نہیں آیا تھا کہ بعینہٖ یہی صورتیں آپ کے لیے بھی پیش آسکتی ہیں، بجنسہٖ یہی حالات آپ کے واسطے بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ میرزا مراد کو یگانہ کی ہاں میں ہاں ملاتے وقت، یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ غالب کے بھی لاکھوں مؤید موجود ہیں۔ غالب کے بھی سیکڑوں شیدائی زندہ ہیں۔ جناب ہرو میرزا صاحبان، یاد رکھیے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں غالب کے لاکھوں معتقد موجود ہیں جو آپ اور آپ کے ایسے ہزاروں مراد و یگانہ کی علمیت و قابلیت کی حقیقت کھول کر رکھ دیں گے۔

ہر جلوہ را امرا نتوانند فریب داد پروانۂ چراغ سر طور بودہ ایم

یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر ان ہر دو میرزا صاحبان نے لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے لڑائی مول لی اور اب اس شکست فاش کا بخاریوں نکالتے ہیں کہ آیات وجدانی میں متعدد مقامات پر لکھنویوں اور لکھنؤ کی شاعری کو برا بھلا لکھا ہے جس کے دو ایک نمونے میں پیش کرتا ہوں۔

صفحہ ۲۱۲ "ورنہ پہلے لکھنؤ میں کنگھی چوٹی کے سوا کیا رکھا تھا اور اب بھی میرزا یگانہ کو چھوڑ کر دیگر حضرات لکھنؤ کے یہاں بھی سوائے جنازہ بازی اور سوگ نشینی کے کلام میں سچے درد کا اثر نہ پاؤ گے"

جناب مراد صاحب، اس دعوے کی دلیل، اس ادعا کا ثبوت، لکھنؤ کی شاعری بجز کنگھی چوٹی کے کچھ نہیں تو اس کے نمونے پیش کیجیے، حضرات لکھنؤ کے یہاں سوائے جنازہ بازی اور سوگ نشینی کے سچے درد کا اثر نہیں تو اس کی مثالیں ذرا دیجیے — ناظرین خود محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ بیان اہلیت سے کس قدر دور ہے۔ میرزا صاحب غلط گوئی اس کا نہیں تو اور کس چیز کا نام ہے، مغالطہ دہی اسے نہیں تو اور کس کو کہتے ہیں۔ لکھنؤ کے قدیم اساتذہ کے کلام کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور کنگھی چوٹی، زلف و رخ، دامن و چولی کے مضامین پر مشتمل ہے مگر اس بنا پر حقارت سے یہ کہہ دینا کہ "اس کے علاوہ اس میں کیا رکھا تھا" حد درجہ کی افترا پردازی ہے۔ لکھنؤ کے موجودہ شعرا کے دواوین کہیں کہیں جنازہ بازی اور سوگ نشینی کے تخیلات پر ضرور منحصر ہیں لیکن اس وجہ سے جسارت سے یہ کہہ دینا کہ "ان کے یہاں سچے درد کا اثر نہ پاؤ گے" انتہائی اتہام ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرزا صاحب نے بغیر شعرائے قدیم یا جدید کے دیوانوں کا مطالعہ کیے یگانہ کی ستایش کی دھن میں غلط سلط جو چاہا لکھ مارا، اور ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں وہ برابر اب تک یہی کرتے آئے ہیں۔ — جناب میرزا مراد صاحب خدا اگر آپ کو توفیق دے تو اب ان دیوانوں کا مطالعہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کا بیان کہاں تک صحیح ہے۔ آپ کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے اور آپ کی تسکین خاطر کے واسطے میں چند اشعار اساتذۂ قدیم کے یہاں درج کرتا ہوں جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ لکھنؤ کے پرانے شعرا کے یہاں کنگھی چوٹی کے علاوہ اور مضامین بھی ہیں۔

خواجہ آتش رح

(۱) دو روزہ ہے یہ لطف عیش و نشاط دنیا	بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں
(۲) آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
(۳) بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
(۴) تکلف سے بری ہے حسن ذاتی	قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
(۵) زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف	قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

ناسخ مرحوم :-

(۱) پھر بہار آئی چمن میں زخم دل آلے ہوئے — پھر مرے داغ جگر آتش کے پرکالے ہوئے
(۲) وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
(۳) ابر رحمت سے تو محروم رہی کشت مری — کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
(۴) کی ادھر دل نے کشش کھینچا ادھر سفاک نے — ٹوٹ کر آخر مرے سینے میں پیکاں رہ گیا
(۵) بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا — روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

اسیر لکھنوی :-

(۱) خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا — ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی
(۲) دل کو نالوں کی دم نزع ہوس باقی ہے — منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے
(۳) روح کے ساتھ ہی قالب میں قضا بھی آئی — شمع آئی مرے گھر میں تو ہوا بھی آئی
(۴) شراب پیر کی طاقت سنبھال رکھتی ہے — دوا مریض کو برسوں سنبھال رکھتی ہے

خواجہ وزیر :-

(۱) ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
(۲) اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
(۳) نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل — دہنِ زخم پکارا کیے قاتل قاتل

مصحفی :-

(۱) حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رویئے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
(۲) شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
(۳) اے مصحفی میں رووں کیا آگلی صحبتاں کو — بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں
(۴) تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو — رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے
(۵) چلے بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم — کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

رند :-

(۱) سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے — اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے
(۲) آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
(۳) کیا ملا عرض مدعا کر کے — بات بھی کھوئی التجا کر کے

قلق

(۱) ادائے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

(۲) خدا ہی خیر کرے آج رنگ بیڈھب ہے — تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

(۳) بہارِ عیش ہوتی ہے خزاں پیری ہے آنے کو — جوانی روٹھی جاتی ہے کہیں کس سے منانے کو

امیر مینائیؒ

(۱) قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

(۲) گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشان سرِ مزار ہوں میں

(۳) ہماری بیخودی تمہید ہے تیری نمائش کی — مٹا کر نقش ہم اپنا ترا نقشہ جما گئے ہیں

(۴) لچک ہے شاخوں میں جنبشِ ہوا سے پھولوں میں — بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

(۵) باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہے ایک کمسن کے لیے

(۶) مری خاک تک لحد میں نہ رہی امیر باقی — انھیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

(۷) مدت سے امیر اُنکے ملنے کی تمنا تھی — آج اُس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

(۸) وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

(۹) لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر — آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے

(۱۰) اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ — مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

حضور علیخاں نسیمؒ (۱) اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا — سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

شوق قدوائیؒ (۲) لب چپ ہیں تو کیا دل گلہ پرداز نہیں ہے — سب کچھ ہے خموشی میں اک آواز نہیں ہے

ہجر لکھنوی (۳) آنکھیں نہ جینے دیں گی تری دلربا مجھے — ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

میر انیس مغفور (۴) یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے — چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

(۵) خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پنڈت نسیم لکھنوی (۶) لائے اُس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

صبا لکھنوی (۷) دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

نامعلوم (۸) نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے — گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

نامعلوم (۹) غمِ صیاد و خوفِ باغباں ہے — دو شعلوں میں ہمارا آشیاں ہے

جلال لکھنوی (۱۰) اک رات دل جلوں کو یہ عیشِ وصال دے — پھر چاہے آسمان جہنم میں ڈال دے

جناب میرزا مرادہ صاحب دوسرا دعویٰ آپ کا یہ ہے کہ یگانہ کے کلام میں، گورِ غریباں، تخئیلِ مرگ، گریہ و زاری وغیرہ کا وجود نہیں ہے۔ ذرا ذیل کے اشعار کو دیکھ لیجیے:-

یگانہ

(۱) آنکھوں کو بند کر کے تصور میں موت کے — پائی نجات کشمکشِ روزگار سے

(۲) تصویرِ نزع دیکھنا چاہو تو دیکھ لو — رہ رہ کے جھلملانا چراغِ مزار کا

(۳) ایسا رونا بھی کوئی روتا ہے — آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

(۴) جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے — شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

اور یہ اشعار بھی اسی لکھنوی رنگ میں ہیں جن پر لکھنوی شعرا کو یگانہ اور مرادا اس قدر بُرا بھلا کہتے ہیں

یگانہ

(۱) گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گریباں سے — جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں

(۲) ڈگمگا کر ذرا کاندھے پہ سہارا جو لیا — ہاتھ کٹوا کے ہیں ظالم نے مرے شانوں سے

(۳) آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیمِ وحشت — تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

مہربان من میرزا صاحب، کون سا ایسا شاعر ہے جسکے کلام میں اس نوع کے اشعار نہ ہوں۔ لکھنؤ کے موجودہ شعرا کے یہاں اگر کہیں رنج و غم، سوگ و ماتم، مرثیہ و مدفن کا تذکرہ ہے تو بس اسی حد تک جہاں تک یگانہ کے اشعار میں ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ موجودہ شعرا کے کلام میں بجز اس قسم کے مضامین کے اور مضامین نہیں تو جناب من ذیل کے اشعار [جن کی تعداد طوالت کے خوف سے میں بہت کم رکھ رہا ہوں] پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عزیز لکھنوی

(۱) دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(۲) مجھ پر نشانہ باندھ کے وہ مسکرا دیا — اب سُن رہا ہوں شور کہ وہ دل اُڑا دیا

(۳) اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

صفی لکھنوی

(۱) غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

(۲) بھری ہیں یاں ہچکیاں شبِ غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے — اُنھیں نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

ثاقب لکھنوی

(۱) رات آئینہ میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کیے — کاروانِ عمرِ رفتہ کا نشاں دیکھا کیے

(۲) یہی سمجھ کے جفاؤں کا سلسلہ چھوڑو — کہ جس کی موت نہ آئے وہ کس طرح مر جائے

سراج لکھنوی (۱) وہ سر مرا، وہ یار کا زانو، وہ شام وصل — اللہ پھر وہ خواب نہ آیا نظر مجھے

محشر لکھنوی (۲)	مجھے اس چھیڑنے چارہ گروں کی اور بھی مارا	کہ تشخیص مرض کے وقت تیرا نام آتا تھا
آشفتہ (۳)	جھلک کرم کی بھی تھی رنگ بے نیازی میں	ہمیں سے بن نہ پڑا عرضِ مدعا کرتے
نیاز فتحپوری (۴)	تری چشم سیہ کے سامنے ہوتا تو ہم کہتے	کہ زاہد دیکھ لے یہ ہے ہمارا عذرِ میخواری
(۵)	تہِ مژگاں وہ چشم مست ساغر دست ساقی ہیں	تبسم ان میں ساغر کے چھلک پڑنے کی تیاری
آرزو لکھنوی (۶)	کچھ تو بقائے حال کی تدبیر چاہیے	اک عالم جنوں کی بھی تصویر چاہیے
(۷)	تازہ وہ پھر سے ہوگئے غم تھے فلک نے جو دیے	جسنے کہ ہنس کے بات کی ہم بھی لپٹ کے رو دیے
احسن لکھنوی (۸)	ہر اک سے پوچھتے ہیں وہ میرے جنوں کا حال	دیوانہ بن گیا ہے کہ دیوانہ ہوگیا
منظر لکھنوی (۹)	اب کسے ڈھونڈتی پھرتی ہے نسیم سحری	اب کہاں جاگنے والا شب تنہائی کا
فنا مرحوم (۱۰)	وہ جام ہوں جو خونِ تمنا سے بھر چکا	یہ میرا ظرف ہے کہ چھلکتا نہیں ہوں میں

صفحہ ۱۳۶ "بعض شعرا نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ کلام میں مصنوعی درد پیدا کرنے کے لیے عالم نزع اور گورستان کا نقشہ کھینچتے ہیں، نزع میں ہاتھ پاؤں کا کھنچنا، پیشانی پر موت کا پسینہ آجانا، گھر اگ جانا، گورِ غریباں کا سناٹا وغیرہ ایسے مصنوعی شعرا کے دل میں قدرتی طور پر درد نہیں ہوتا خارجی طور پر درد پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ناکامیاب رہتے ہیں۔"

میرزا مراد صاحب لاکھ چھپانے کی کوشش کریں مگر

من انداز قدت را می شناسم

ہر شخص مذکورۂ بالا عبارت سے پتہ چلالے گا کہ ان کا روئے سخن شعرائے لکھنؤ کی طرف ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ لکھنؤ کے بعض شعرا اکثر اسی قسم کے اشعار کہتے ہیں جن میں مندرجۂ بالا طریقوں سے درد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اول تو یہ کہ تمام شعرا ایسا نہیں کرتے، دوسرے جو شعرا ایسا کرتے ہیں اُنکے ہاں بھی سچے اور صحیح درد کے نمونے ملتے ہیں، تیسرے جب شاعری کا مفہوم حالات اور حادثات انسانی کا دلکش طرز میں ادا کرنا ہے تو کسی شاعر کا گانا ہے گا ہے اس نوع کے اشعار کہہ کہنا کچھ ایسا غیر مستحسن نہیں علاوہ بریں اُردو کے تمام اساتذہ، کیا اہل لکھنؤ، کیا اہل دہلی، کیا اقبال، کیا یگانہ، سب کے یہاں کچھ نہ کچھ اشعار اس قسم کے نکلیں گے۔ یگانہ کے ہاں سے چند کی مثال میں اس سے قبل دے چکا ہوں جس سے میرے دعوے کا ثبوت مل جائے گا۔

گزشتہ چند سال سے لکھنؤ کی شاعری اور لکھنؤ کے شعرا کے خلاف جو مسلسل اور قابل اعتراض پروپیگنڈا

ہو رہا ہے وہ کسی طرح بھی لائق تحسین نہیں، لکھنؤیوں کے ذوق سلیم اور مذاق سخن کے متعلق جو دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے وہ کسی آئینہ بھی مناسب نہیں۔ ایسے اشخاص کی فہرست میں سب سے زیادہ قابل ذکر چند اعظم گڈھی حضرات کی ہستیاں ہیں جو ان کوششوں میں سب سے پیش پیش ہیں۔ جناب جگر مراد آبادی کے دیوان اول "کلام جگر" کے مقدمہ میں اُنھیں حضرات میں سے ایک نے لکھنؤ کی شاعری اور لکھنؤ کے شعرا کے متعلق جو جلے پھپھولے توڑے وہ غیر صحیح اور یکطرفہ ہونے کے باوجود لب و لہجہ کے لحاظ سے اتنے درشت نہیں تھے کہ ان سے شدت کے ساتھ تعرض کیا جاتا۔ یہ سمجھ کر خاموشی اختیار کی گئی کہ

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

لیکن اثر لکھنوی کے مضمون "نشاط روح پر تنقید" کے جواب میں جو "بسیط نظر" اعظم گڈھ کے ایک صاحب نے ڈالی اور لکھنؤ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا وہ اتنا جانبدارانہ اور سخت تھا کہ اس پر صلح جو سے صلح جو انسان کو ناگواری ہونا لازمی تھا۔ ایک انگریزی مثل ہے

Even a worm would turn (ایک کینچوا تک حملہ کر دے گا)

آخر لکھنوی کہاں تک ضبط کریں، بہر حال انسان ہیں، بر اسلوب ہی ہوتا ہے لیکن معترض صاحبان اس لازمی ناگواری، اس قدرتی تنغص، اس فطری مدافعت کو بھی اس کی اصلی روح کی روشنی میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اس "کوشش صفائی" کو پیشتر سے زیادہ نشانہ ملامت بناتے ہیں

غرض دو گونہ عذاب ست جان مجنوں را

میں لکھنؤ کے رنگ شاعری کا بہت قدرداں نہیں، نہ مجھ کو شعرائے لکھنؤ کے لطائف ادبی اور کاوشِ ذہنی سے بحث ہے۔ میں نہ اُنکے تخیلات کا زیادہ معترف ہوں نہ اُن کے اشغال کا بے حد معترف، مجھے اُن کے ذاتی افعال، شخصی چال چلن سے نہ تعرض ہے نہ اُن کا تجسس۔

There are black sheeps in every herd

ہر گلہ میں چند کالی بھیڑیں ضرور ہوتی ہیں۔

اس لیے اگر لکھنوی شعرا کے دائرہ میں بعض ایسے بھی نکلیں جو شرافت سے بیگانہ اور انسانیت سے معرا ہوں تو اس سے لکھنؤ کے مجموعہ شعرا یا لکھنوی رنگ شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا، میرا مقصد یہاں صرف اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ لکھنؤ کا "رنگ شاعری" جو اس درجہ "نشانہ ملامت" و "ہدف مخاصمت" بنایا جا رہا ہے وہ کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ بیشک قدیم لکھنوی اساتذہ کے کلام کا معتد بہ حصہ غیر فطری جذبات پر مشتمل ہے، ان کے افکار کی نمایاں مقدار لفظوں کا طلسم ہے، ان کے اشعار کا کافی ذخیرہ صنائع و بدائع کا گورکھ دھندا ہے

لیکن کیا اس میں کہیں بھی فطری جذبات کی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ کیا اس میں کسی جا بھی دل کو تڑپا دینے والے اشعار نہیں ملتے۔ جو لوگ مدعی ہیں کہ انھیں لکھنؤ کی قدیم شاعری میں کسی جا عمدہ شعروں کا نشان نہیں ملتا سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نغمے نہیں سنائی دیتے۔ قلب خیز و روح بیز صدائیں کانوں میں نہیں آتیں۔ انکا دعوےٰ ان کی کوتاہ بینی اور تعصب کی نشانی ہے، آتش، انیس، امیر، جلال، تسلیم کے ہزاروں اشعار ایسے ہیں جو بجائے خود ایک نادر و نایاب خزانہ ہیں، ایک بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ علاوہ بریں لکھنؤ کا کون شاعر، بجز چند غیر مشہور شعراء کے، ایسا ہے جسکے کلام میں درِ ہیں اشعار صحیح ذوق اور مناسب وجدان کے نہ نکلیں۔ سب کا سب کلام تو کسی شاعر کا بھی نہیں اچھا ہوتا۔ کون سا وہ شاعر ہے جسکے ہر شعر پر عرب و عجم کے سرمایہ جات شاعری قربان ہوں، جسکے ہر مصرعہ پر فصاحت و بلاغت، معنویت و جامعیت صدقے ہوں، جسکے ہر لفظ پر "نطق اعرابی" اور "عقل یونانی" نثار ہوں۔

میرزا صاحب یگانہ و مراد کو شکایت ہے کہ لکھنؤ والے صرف اُنھیں لوگوں کو لکھنوی سمجھتے ہیں جو گومتی کے اِس پار پیدا ہوئے، وہیں پلے، وہیں پڑھے، اُسی جگہ مرے، اُسی جگہ گڑے۔ لغوی حیثیت سے لفظ لکھنوی کے معانی وہی ہیں جس پر میرزا صاحبان کو اعتراض ہے مگر اصطلاح میں جن کو لکھنوی کہتے ہیں اور جن پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا چلا آیا ہے وہ اُن لکھنویوں سے بالکل جدا ہیں جو لغوی حیثیت سے لکھنوی کہلانے جانے کے مستحق ہیں۔ ناسخ، مصحفی، انشا، انیس، میں سے کوئی بھی لغوی معانی کے لحاظ سے لکھنوی نہیں تھا، لیکن کیا آج تک کسی نے ان کے لکھنوی ہونے میں شبہ کیا؟ یگانہ بھی اگر خود کو لکھنوی ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ لکھنوی کا لفظ لکھتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب لکھنؤ کی شاعری اس قدر غیر فطری ہے، اس درجہ حقیقت سے دور ہے، جب لکھنوی شاعر ہونے کے معنے کنگھی چوٹی کے مضامین نظم کرنے والا شاعر ہیں جب لکھنوی اُستاد ہونے کا مفہوم، نزع و گورستان کے خیالات باندھنے والا اُستاد ہے تو غیر لکھنویوں کو اپنے نام کے ساتھ لکھنوی لکھنے کا اس درجہ شوق کیوں ہے؟ جب لکھنؤ کے سر پر کوئی طرۂ امتیاز نہیں ہے تو عظیم آبادی، فیض آبادی، اعظم گڈھی اپنے آپ کو لکھنوی لکھنا کیوں باعثِ تفاخر سمجھتے ہیں۔ جب لکھنؤ کا رنگ شاعری نہایت بے وقعت ہے تو بیرون لکھنؤ کے شعرا کیوں خود کو لکھنؤ سے منسوب کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح اپنی تنقیص کرتے ہیں۔ ناسخ کی شاعری پھیکی تھی، رند و وزیر کے یہاں زلف و رُخ کے مضامین ہوتے تھے، امانت و اسیر کے دیوان بے مزہ ہیں، امیر و جلال کے اشعار صنائع و بدائع کے طلسم ہیں اور یہ سب حضرات لکھنوی تھے تو پھر کیوں یگانہ یا کوئی اور بیرونی شاعر لکھنوی ہونے پر فخر کرے یا لکھنؤ سے

منسوب کیے جانے کو اپنا اعزاز سمجھے، اہل لکھنؤ اپنی ہٹ دھرمی ہی کی بنا پر سہی، اسے لکھنوی سمجھنے سے انکار کر دیں تو وہ کیوں زمین و آسمان سر پر اُٹھائے، گومتی کے اِس پار کے رہنے والے اپنی نالائقی اور کم ظرفی کے سبب ہی سے سہی اسے اپنے میں شامل کرنے پر تیار نہ ہوں تو وہ کیوں ہند و فارس کے شعرا سے فریاد کرے

سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ محض لکھنؤ میں پیدا ہونے سے انسان اہل زبان، شاعر اور ادیب نہیں ہو جاتا، بالکل بجا، ہر طرح صحیح۔ میر، سودا، مصحفی، نہ لکھنؤ کے باشندے تھے نہ دلی کے، اول الذکر دو، نہ دلی میں پیدا ہوئے تھے نہ لکھنؤ میں۔ لیکن ان کی شاعری نے کس جگہ عروج پایا، کس گہوارہ میں پرورش پائی کس سرزمین کے باشندوں نے مصیبت کے وقت ان کی امداد کی۔ مصحفی امروہہ کے متوطن تھے اور وہیں کی پیدائش، لیکن ان کے ذوق سلیم کی آفرینش کس خطہ میں ہوئی، کونسی سلطنت نے انھیں پروان چڑھایا۔ یہ سب لکھنؤ کی خاک پاک کے کرشمے تھے، اسی مقدس سرزمین کے کھیل تھے، میر و سودا آج دہلوی کہلاتے ہیں، مصحفی امروہوی، لیکن حق یہ ہے کہ انھیں بھی لکھنوی کہا جائے، انھیں بھی لکھنؤ کی سرزمین سے منسوب کیا جائے، یہیں اُنھیں کامیابیاں حاصل ہوئیں، یہیں اُن کے سروں پر سہرے بندھے۔ انیس بھی لکھنؤ کی پیدائش نہ تھے، اُنھیں کیوں لکھنوی کہا جاتا ہے، ناسخ بھی لکھنؤ کے متوطن نہ تھے اُنھیں کیوں لکھنوی لکھا جاتا ہے۔ انشا بھی لکھنؤ کے باشندے نہ تھے انھیں کس بنا پر لکھنوی سمجھا جاتا ہے۔ ان شعرا کا بھی تو لکھنؤ صرف امن تھا مولد نہیں ویسے ہی وہ میر و سودا، مصحفی و انشا کا مسکن تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ آخر الذکر چاروں حضرات لکھنوی نہیں کہلاتے اور اول الذکر اصحاب لکھنوی لکھے جاتے ہیں ـــــ آپ ناسخ کی شاعری کو بُرا کہکر لکھنؤ کے مذاق سخن کو مذموم کہہ دیتے ہیں لیکن آتش کے کلام کی خوبیوں کو دیکھ کر لکھنؤ کے رنگ شاعری کی تعریف نہیں کرتے، آپ امیر و وزیر کے دیوانوں کی تنقیص کر کے لکھنؤ کے سرمایۂ ادب کو تہی مایہ تو کہہ دیتے ہیں لیکن میر و مصحفی کے کلیات کی تعریف کر کے لکھنؤ کے ذخیرۂ اشعار کو نادر و نایاب نہیں لکھتے، بُرائی تو لکھنؤ سے منسوب کر دی جاتی ہے لیکن اچھائی کو لکھنؤ سے نسبت نہیں دی جاتی۔ غیر فطری اشعار پر تو لکھنؤ کے رنگ شاعری کو مطعون کیا جاتا ہے لیکن حقیقی جذبات کے شعروں پر لکھنؤ کے مذاق سخن کا اعتراف نہیں کیا جاتا، نکتہ چینی کا مادہ تو ہے نکتہ رسی کا نہیں۔

علاوہ بریں لکھنؤ کے مخصوص رنگ ہی کو لیجیے، وہ فطری جذبات کے مطابق نہ سہی، وہ ذوق سلیم پر گراں سہی، وہ صرف حسن ظاہری کا مظہر سہی اوصاف معنوی کا مرقع نہ سہی، لیکن کیا بجائے خود کمال

کی دلیل نہیں۔ آج ہے کوئی ایسا جو اسی رنگ کے اشعار اتنی ہی جامعیت اور کاملیت کے ساتھ کہہ سکے؟ بڑے بڑے شعرا موجود ہیں، گڑھ اصغر پر ناز کرتا ہے اور بجا، عظیم آباد یگانہ پر اتراتا ہے اور صحیح، پنجاب اقبال و حفیظ پر تعلّیاں کرتا ہے اور درست، لیکن کہیں سے یہ صدا نہیں سنائی دیتی،

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوعِ صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا (ناسخؔ)

کوئی خطہ حسن ظاہری کے یہ نمونے نہیں پیش کرتا

تذکرہ کچھ تو کیا میری پریشانی کا — آج مجھے وہ بہت زلف کی سرگوشی سے (امیر مینائی)

کوئی ہے ایسا جو یہ دعویٰ کرے کہ انھیں نغموں سے پھر دماغوں کو مست بنا دے گا، انھیں ترانوں سے پھر دلوں کو سرشار کر دیگا، نکتہ چینیاں کرنے والے سیکڑوں ہیں، اعتراض کرنے والے بہت ہیں، عیب نکالنے والے ہزاروں ہیں لیکن کمال کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔

نکتہ چینوں کے سوا کوئی نہیں قدر شناس — آپ بربادیِ ارباب ہنر کیوں تو

چمکتے ہوئے موتیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلی گئیں، روشن ستاروں کی طرف سے منہ پھیر لیا گیا نظر گئی تو کہاں، بے آب گوہروں کی طرف، کھوٹے سکوں کی طرف

اے آں کہ خوب ما نہ شناسی ز زشت ما

اعظم گڈھ کے ایک اور میرزا صاحب لکھنؤ کی شاعری کے غیر فطری ہونے پر بہت درشت تنقید کرتے ہیں، اس کے غیر جمالیاتی ہونے پر بہت بُرا بھلا کہتے ہیں، انکے "شاہدانِ بام کی عشوہ طرازیوں کے فریب خوردہ" دماغوں کا ماحصل ہونے پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ رسالہ معارف میں ان کی چند غزلیں میری نظر سے گزریں اور مجھے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہ ملا جس سے دل میں تڑپ پیدا ہوتی، جس سے روح میں بیداری نمایاں ہوتی، جس سے سینے میں اضطراب ہویدا ہوتا، پھر بھی یہ شور ہے یہ واویلا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری صرف حسنِ ظاہری کا مرقع ہے۔ حسنِ ظاہری ہی کا مرقع سہی لیکن کسی کمال کا نمونہ تو ہے آپ کی شاعری نہ تو دلی کے "جگر سوز نغمے" ہیں نہ لکھنؤ کے "خوشنما و خوبصورت موتی"

اور آپ ہیں عاشق کے امتحاں کے لیے

پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی ہے۔ لکھنؤ کے موجودہ شعرا پر بھی حملے کیے جاتے ہیں جنکی شاعری قدیم رنگ سے گویا کہ ناآشنا ہے۔ ان لوگوں پر اعتراض کیے جاتے ہیں جو نئے رنگ کی شاعری

کے "علمبردار" ہیں جو شاعری کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کے مبلغ ہیں، جن کی پہلی آوازیں تھیں جنھوں نے مکاتب تجارہ کو چونکا کر پیغام بیداری سنایا۔ جن کے اولیں راگ تھے جنھوں نے دلوں میں نئی روح پھونکی۔ لیکن ان ہر سہ مرزا صاحبان کو موجودہ دور کے شعرا کے یہاں بھی کہیں کوئی اچھا شعر نہیں ملتا۔ ان کے کانوں پر غیر لکھنوی شعرا کے کلام کی مہر ہے، وہ بیکسے لکھنؤ کے خوش الحان نغمہ سراؤں کا چہچہانا سن سکتے ہیں۔ عزیز کے قصائد پر انھیں اعتراض ہے، صفی کی غزلیں انھیں ناپسند ہیں، سراج کے اشعار انھیں نہیں بھاتے ہیں، آثر و آشفتہ کی خوشنوائیاں انھیں گراں گزرتی ہیں۔ غرض ہر پھر کے لکھنؤ کے شعرا سے بغض، لکھنؤ کی شاعری سے عداوت،

—— ہر طرف سے یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ لکھنؤ کی شاعری بیکار ہے، لکھنؤ کے اساتذہ مہمل گو ہیں۔ لاہور سے ہے تو یہی صدا آتی ہے، عظیم آباد سے یہی ندا سنائی دیتی ہے۔ اعظم گڈھ سے یہی شور اٹھتا ہے، حیدر آباد سے یہی غوغا آتا ہے اور یہ سب کیوں، صرف اس بنا پر کہ لکھنؤ والوں کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ لکھنؤ کے علاوہ اور کہیں اچھے سخنور نہیں، میں اصغر کا دیوانہ ہوں، جگر کا فدائی، میں فانی کا دالہ ہوں، اقبال کا عاشق، میں حفیظ کا فریفتہ ہوں حسرت کا مجروح، لیکن میں اسی کے ساتھ عزیز کا بھی قائل ہوں صفی کا بھی قدردان، سراج کا بھی معترف ہوں آثر کا بھی معترف، آشفتہ کا بھی چاہنے والا ہوں، ناطق کا بھی پسند کرنے والا، اور جب کبھی غور کرکے دیکھتا ہوں ذوق سلیم اور وجدان صحیح کا اجتماع، بلند پروازی تخیل اور حسن زبان کا مرکز، بجز لکھنؤ کے کسی کو نہیں پاتا، اس خطے میں جو جامعیت دیکھتا ہوں ڈھونڈھتا ہوں کہیں نہیں ملتی۔ حیدر آباد میں نے دیکھا، لاہور کی میں نے سیر کی، اعظم گڈھ میں گیا، عظیم آباد میں پہونچا۔ لیکن کہیں کے باشندوں میں، کسی جگہ کے رہنے والوں میں وہ لوچ، وہ فطرتی جوش طبیعت، وہ پیدائشی زباندانی نہیں پائی جو لکھنؤ کی مردم خیز سرزمین میں دیکھی۔ آج پنجاب ناز کرتا ہے کہ وہ اردو کی صحیح خدمت انجام دے رہا ہے، اسکے ثبوت میں وہ پنجاب کے مختلف ادبی رسائل، متعدد علمی ادارے متفرق و بہی شاعر، پیش کردیتا ہے، حیدر آباد اپنی جگہ پر مغرور ہے کہ وہ اردو کی اہم ترین خدمت انجام دے رہا ہے، جس کے اثبات میں وہ دار الترجمہ اور جامعہ عثمانیہ سامنے لاتا ہے۔ لکھنؤ سے کوئی پوچھے کہ وہ اردو کی کیا خدمت کر رہا ہے، وہ اردو کو کیا فائدہ پہونچا رہا ہے، لکھنؤ کوئی شے ثبوت میں نہ پیش کرسکے گا، نہ وہاں علمی ادارے ہیں نہ ادبی رسائل کی بھرمار، نہ وہاں دار الترجمہ ہے نہ جامعہ عثمانیہ، لیکن باوجود اسکے آپ ایک پنجابی، ایک حیدر آبادی، اور ایک لکھنوی کا مقابلہ کرکے دیکھیے جتنا

صحیح ذوق آپ لکھنؤ ہی میں پائیں گے، جس قدر سلیس اُردو وہ بول لیگا، جتنی رواں اور شستہ عبارت وہ لکھ لیگا نہ حیدرآبادی سے ممکن ہوگی نہ پنجابی سے۔ اور پھر بھی ان ممالک کے مدعیوں کو دعویٰ ہے کہ صرف وہی اُردو کے مالک، بس وہی اُردو ادب کے شہنشاہ ہیں۔

خویش را صورت پرستاں ہرزہ رسوا کردہ اند   جلوہ می نامند در معنی نقابے بیش نیست

بات اصل میں یہ ہے کہ پنجاب اور حیدرآباد کے عوام الناس باوجود علمی اداروں، دارالترجموں اور جامعوں کے ابھی تک اُس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جہاں لکھنؤ کا ایک ایک فرد ہوش سنبھالتے ہی جا پہونچتا ہے۔ لکھنؤ نے اُردو زبان اور ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور اسی خدمت کا یہ طفیل ہے کہ لکھنؤ والوں کے خمیر میں، اہل لکھنؤ کی گھٹی میں، زبان کا ذوق اور ادب کا چسکا شامل ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا بچہ بچہ آنکھ کھولتا ہے تو خود کو علم و ادب کے گہوارے میں دیکھتا ہے، برخلاف اسکے پنجاب اور حیدرآباد کا طفل نوزائیدہ اُسوقت تک اپنے کو صحیح ماحول میں نہیں پاتا جب تک کہ وہ جامعہ میں قدم رکھ کے ادبی اداروں کی ہوا نہ کھالے، دارالترجموں کی کتب نہ پڑھ لے، ادبی رسائل کا مطالعہ نہ کرلے۔ لکھنؤ کے باشندوں کے ذوق کی ان چیزوں سے ابتدا نہیں ہوتی، اُس پر ان چیزوں سے صیقل ہوتی ہے جو اس کی زباندانی کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ لکھنؤ کے اکثر حضرات اس امر پر اکڑتے ہیں کہ وہ اہل زبان ہیں، اہل قلم ہیں، لکھنؤ کے متعدد اشخاص اس پر ناز کرتے ہیں کہ شاعری اور سخنوری انکی میراث ہے اُن کی لونڈی ہے یہ سب سہی، لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ بجائے ان اشخاص پر اعتراض کرنے کے لکھنؤ اور اس کی سات پشتوں کو برا کہا جائے، اُس کی اُن برگزیدہ ہستیوں پر تبرا بھیجا جائے جو تمام ہند کے لیے یکساں مایۂ ناز ہیں، اسکے اُن علماء و فضلاء پر لعنت کی جائے جنکی ذکاوت، ذہانت اور قابلیت مسلم ہے، جنکی استادی کے جھنڈے آج تک گڑے ہوئے ہیں۔

ایں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

مختصر یہ کہ لکھنؤ والوں اور اُن کے شعراء کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور اس کے ضمن میں جو غلط بیانیاں کی جا رہی ہیں اُن کا ازالہ بہت ضروری اور اہم ہے، ورنہ ہندوستان کے دور افتادہ صوبوں کے باشندوں کے دماغوں میں لکھنؤ کی طرف سے جو بدظنی اور بدگمانی جڑ پکڑ رہی ہے وہ مضبوط ہو جائیگی اور لکھنؤ راندۂ درگاہ ہوکر اپنا وہ افتخار جو اُسے تہذیب و تمدن، ادب و زبان کے مرکز ادبی کی حیثیت سے حاصل ہے کھو بیٹھے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اہل لکھنؤ پر لازم ہے کہ وہ اپنے ان معدودے چند حضرات کی ذہنیت

کی اصلاح کی طرف جلد توجہ کریں جو لکھنؤ کو بدنام کرتے ہیں اور اس کی شرافت اور وقار پر دھبہ لاتے ہیں، جو بیرونی شعرائے اس قدر غیر شریفانہ برتاؤ کرتے ہیں کہ وہ انھیں اور انکے ہمراہ لکھنؤ کی سات پشتوں کو بُرا کہنے اور اُن پر لعنت بھیجنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(۸)

آیات وجدانی کی اشاعت کے تینوں مقاصد پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالی جاچکی۔ ناظرین پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ اس کتاب میں کس جعل و فریب، کس تہمت و بہتان، کس غلط بیانی و مغالطہ دہی، کس حسد و تعصب کا جال پھیلایا گیا ہے۔ لیکن ابھی ایک رُخ اور باقی ہے جسکو نظرانداز کرنا نہ صرف بے انصافی ہوگی بلکہ بغیر اس کے نفس تنقید بھی تشنہ رہیگی۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ ایک حد تک "ترکی بہ ترکی" کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر سخت کلامی کا ازالہ سختی سے کیا گیا ہے، ہر بے عنوانی کو عنوان مضمون کی طرح جانچا گیا ہے، ہر غیر متین جملے کا جواب حسب اقتضائے حال دیا گیا ہے، ہر غیر سنجیدہ عبارت کا ابطال اسی طرح کیا گیا ہے۔ لیکن اب جس پہلو سے بحث کرنا ہے اُس کا اقتضا ہے کہ اسے نقادی کے صحیح اصولوں کے تحت جانچا جائے۔

انسان کی فطرت بذاتہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوئی اور نہ ہوگی ابتدائے آفرینش سے انسان جن محاسن و معائب، جن خوبیوں اور خامیوں، جن صفتوں اور عیبوں کا مجموعہ رہا ہے، انتہائے کائنات تک ویسا ہی رہے گا۔ گو فطرت انسانی کے لواحق میں تغیر ہو سکتا ہے اور ہوتا جاتا ہے اصل اٹل ہے لیکن فرع تبدیل پذیر۔

انسان پیدائشی طور پر متکبر، مغرور اور خود پسند ہے۔ شعرا بھی چونکہ انسان ہیں اس لیے ان کمزوریوں سے مبرا نہیں، لیکن بیشتر شعرائے قدیم میں تہذیب، متانت، سنجیدگی، انکسار، سکے اجزا ان نقائص کے لیے پردہ بن جاتے تھے۔ شعرائے حال کی اکثریت سے آخرالذکر صفات گویا کہ معدوم ہیں۔ آج ہر شاعر یہی سمجھتا ہے کہ وہ سرتاج الشعرا ہے۔ جملہ شعرا سے افضل ہے، زمرۂ شعرا میں سب سے زیادہ لائق و فائق ہے، ابوالمعانی ہے، ابوالشعر ہے، پہلوان سخن ہے، لسان الملک ہے، مصور فطرت ہے، جانشین داغ ہے۔ اس امر کا اندازہ ان کے طرز عمل، ان کے طریق زندگی، ان کے دَور حیات سے آسانی ہو سکتا ہے۔ اس پر یگانہ کا یہ خیال کرنا کہ وہ موجودہ شعرا میں لایق ترین ہیں، فن شعر میں اُستاد یگانہ ہیں، ان کے اشعار میں سقم یا کمزوری کا وجود ناممکن ہے۔ کچھ تعجب خیز نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شاعر غلطی کرتا ہے، ہر اُستاد ٹھوکر کھاتا ہے۔ بشر خطا و نسیان کا پُتلا ہے اور شاعر بھی بشر ہے،

اس لیے اگر اس سے خطا کا ارتکاب ہو تو وہ لائق تعزیر نہیں۔ لیکن اس شاعری میں تدریج ممکن ہے اور
ایسا ہی ہوتا ہے، بعض شاعر کم غلطیاں کرتے ہیں بعض زیادہ۔ اور اس کا انحصار ان کی انفرادی
قابلیت، علم اور جامعیت پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ کسی شاعر کے
دس پانچ ہزار شعروں پر مشتمل دیوان میں دس بیس پچاس خامیاں نکل آنے کے یہ معنی نہیں کہ اس سے
طرۂ استادی چھین لیا جائے۔ جہاں تک میرا مطالعہ شہادت دیتا ہے، مشاہیر اردو شعرا کی فہرست میں
سب سے کم خامیاں امیر مینائیؒ کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور سب سے زیادہ نواب میرزا خاں صاحب
داغ مرحوم کے یہاں۔ لیکن باوجود اس کے دونوں کا شمار اساتذہ کے زمرے میں ہے۔ موجودہ جدید
رنگ کے شعرا کے دائرے میں زیادہ تر تعداد طبعی شعرا کی ہے جنھوں نے شاعری کو بطور کسب حاصل
نہیں کیا بلکہ بحیثیت جزو فطرت پایا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی قابلیتیں، ان کا تجر اس پایہ کا نہیں ہوتا جو
شعرائے قدیم کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔ لہٰذا جہاں تک اصول شاعری کا تعلق ہے جدید شعرا نسبتاً زیادہ
ٹھوکریں کھاتے ہیں گو وجدانی اور فطری شاعری کے زاویۂ نگاہ سے ان کی شاعری یقیناً اعلیٰ ہوتی ہے۔

میرزا مراد بیگ شیرازی نے آیات وجدانی میں جس انداز و طرز سے یگانہ کی تعریف و توصیف
کی ہے اس کا اقتضا تھا کہ وہ انھیں کامل اور اکمل شاعر، مکمل اور سب سے بڑا استاد کہیں، اور یہی انھوں
نے کیا ہے۔ ان کی نظر میں وہ واقعی استاد یگانہ، شاعر فرزانہ ہیں، نفس الامر میں سخن دیکھا، سخن فہم
بے ہمتا ہیں۔ میں اس کا مدعی نہیں کہ وہ اصلیت سے بالکل بیگانہ ہیں لیکن بیگانہ ضرور ہیں۔ بقیہ حصۂ
مضمون میں میں اسی امر پر روشنی ڈالوں گا۔ میرا مقصد اس حصے میں یگانہ سے بحیثیت ایک شاعر اور
استاد کے بحث کرنا ہوگا۔ اس جزو میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ ان میں کتنی قابلیت ہے
اور کتنی ناقابلیت، کس قدر علم ہے اور کس قدر جہل، کس درجہ ذہانت ہے اور کس درجہ غباوت۔

جس طرح قانون میں جرم کی کوئی جامع اور مختتم تعریف آج تک نہ ہو سکی، اسی طرح ادب میں شعر
کے لیے کوئی مفصل اور مکمل نظریہ نہیں دریافت کیا جا سکا۔ قابل سے قابل عقلوں اور ذہین سے ذہین دماغوں
نے کوشش کی کہ شعر کو معروف کر سکیں لیکن ہر تعریف میں اور ہر نظریہ میں کوئی نہ کوئی کسر رہ گئی۔ یہی وجہ ہوئی
کہ شعر کی تعریف definition کے سلسلے میں تمام اساتذہ اور سب علما متفق نہیں۔ کوئی کہتا ہے
کہ وہ صرف سادہ زبان میں ہو، کسی کا خیال ہے کہ بس وہ صحیح جذبات کا مرقع ہو، بعضوں کی رائے ہے
کہ اس میں محض طائرِ تخیل پایا جانا چاہیے، اکثر کا گمان ہے کہ اس میں صرف صنائع اور بدائع کا
وجود ہو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ نئے رنگ کا دلدادہ شاعر، جدید طرز کا گرویدہ استاد، اسے

قید عروض، زنجیر قافیہ سے بھی مستغنی کر دینا چاہتا ہے، اس کی نظر میں تقطیع پر اس کا پورا اترنا لازمی نہیں ہے، صرف موزونیت ضروری ہے اور بس۔ بہرحال جس کا جیسا خیال ہو، اس امر پر سب متفق ہیں کہ شعر اس وقت تک شعر ہی نہیں جب تک موزوں نہ ہو۔ اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے، ہم ذیل کے شعروں کو بھی شعر کہہ سکتے ہیں، رہا یہ سوال کہ یہ شعر اچھے ہیں یا برے؟ ہمیں فی الحال اس سے کوئی بحث نہیں۔

(۱) دندان تو جملہ در دہانند — چشمان تو زیر ابروانند

(۲) جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے — جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

(۳) انسان کو ہر حال میں انسان کہیں گے — اور جو نہ ہو انساں اُسے حیوان کہیں گے

(۴) اُن کے خط میرے پاس آتے ہیں — میرے خط اُن کے پاس جاتے ہیں

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف تک بندی ہے۔ موزونیت کی حد تک تو ضرور ان پر لفظ شعر کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر کسی باذوق آدمی سے دریافت کیجیے وہ کبھی انھیں شعر کہنے پر تیار نہ ہوگا۔ مگر جب چوتھے شعر میں کہی ہوئی بات ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اس طرح ادا کی جاتی ہے تو ہر شخص اسے شعر کہنے پر تیار ہو جاتا ہے

(۵) آ چکا خط جا چکا خط کا جواب — اضطراب و اضطراب و اضطراب (جگر مراد آبادی)

آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ ہم کیوں شعر ۴ کو شعر کہنے پر راضی نہیں اور شعر ۵ کو شعر سمجھنے پر تیار ہیں، درانحالیکہ مطالب میں بہت خفیف سا فرق ہے؟ ایک مثال اور لیجیے

(۶) زخمی کر کے مجھے نادم ہیں یہ کن باتوں میں — اور اگر ہوں گے تو بے وقت پشیماں ہوں گے (مومن مرحوم)

اسی مضمون کا دوسرا شعر ہے

(۷) کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (غالبؔ)

ایک تیسرے شاعر نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

(۸) مرگ عاشق پہ روتے ہیں معشوق — کب پشیمان ہوتے ہیں معشوق

موزونیت کے لحاظ سے آخری شعر ضرور شعر ہے مگر اشعار غالب و مومن کے سامنے شعر کہلانے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح غالب و مومن کے شعروں میں سے آپ کس کے شعر کو ترجیح دیں گے؟ لامحالہ غالب کے شعر کو ۔۔۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ آپ سے کہا جائے کہ ان دونوں اشعار میں سے صرف کسی ایک پر لفظ شعر کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے، تو بتائیے آپ کس شعر کو انتخاب کریں گے؟ یقیناً غالب کے شعر کو ۔۔۔ تو آخر دونوں میں کیا فرق ہے جو ان دونوں اشعار کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے دونوں تقریباً ایک ہی ہیں، تفاوت آخر کس چیز کا ہے؟ صرف انداز بیان کا ۔۔۔ کسی مضمون کو کسی

مطلب کو سیدھا سیدھا، بعینہٖ اسی طرح جس طرح وہ نثر میں لکھا جا سکتا ہے نظم کر دینا موزونیت کی حد تک تو ضرور اسے شعر بنا دیتا ہے لیکن شعر کے اور لوازمات اس میں نہیں پائے جاتے جس کی بنا پر نقاد انھیں اسے شعر تصور کرنا بھی زیادتی سمجھتی ہیں، مثال کے طور پر میں ذیل کے اشعار لکھتا ہوں۔

(۱) جس نے نہ کبھی عمر میں کچھ قرض لیا ہو — واللہ اُسے صاحبِ ایمان کہیں گے

(۲) کُتا ہو کہ انسان ہو غرض کہ وہ کوئی ہو — دروازے پہ بیٹھے گا تو دربان کہیں گے (حکیم گلباز)

(۳) نار سے پہلے نوح تو آرسے آئے — آرسے پہلے نوح تو نار سے آئے ([illegible])

(۴) زیادہ سے زیادہ ہوگی گنتی ستر تک — اکھتر اور بہتر اور تہتر آپ کیا جانیں (خنجر کاکوروی)

مندرجہ بالا سب اشعار موزونیت کے نقطۂ نظر سے شعر ہیں، مطلب ان میں واضح اور اصلیت پر مبنی ہے، قافیہ اور ردیف کی پابندی کی گئی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ان کو تک بندی کہتے ہیں شعر نہیں سمجھتے۔ وجہ وہی ہے جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں، یعنی اندازِ بیان، طرزِ ادا۔ یگانہ کے اکثر اشعار میں یہی نقص ہے کہ وہ نثر کو محض نظم کر دیتے ہیں، تخیل بلند اور کہیں کہیں بہت بلند ہوتی ہے۔ مطالب اصلیت کے مطابق ہوتے ہیں، موزونیت موجود ہوتی ہے ردیف و قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے مگر باوجود اس کے سامع کی طبیعت انھیں سن کر خوش نہیں ہوتی، وہ طوعاً کرہاً، خوشامد کے خیال سے، مروت اور اخوت کی خاطر، تعریف کر دے مگر اس کا قلب شعر کی خوبی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اپنے اس جذبہ کا تجزیہ کرتا ہے لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ جس شاعر کا شعر ہوتا ہے وہ سامع کی جھوٹی تعریف سے متاثر ہو جاتا ہے، اُسے شکایت ہوتی ہے کہ اُس کے شعر میں شعر کے تمام لوازم موجود تھے، مگر باوجود اس کے سامعین نے اُسے پسند نہیں کیا، اس کی حقیقی داد نہیں دی۔ وہ اسے سامعین کے بغض و حسد پر محمول کرتا ہے اس کے ہوا خواہ، اس کے ہمدرد، دوست، عزیز، شاکی ہوتے ہیں، کہ عوام کا مذاق، پبلک کی ذہنیت ناقص ہیں، کہ وہ ایک شاعر کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہیں، واہ واہ سے چھتیں اُڑا دیتے ہیں اور دوسرے شاعر کے اُسی مضمون کے شعر پر گونگے بن جاتے ہیں۔

ذوق مرحوم کا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جو سنتا ہے اس شعر کی تعریف کرتا ہے، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے، اس کے اثر سے مبہوت ہو کر سر دُھنتا ہے، لیکن داغ کا اسی مضمون کا شعر ہے

آرام کے لیے ہے تمھیں آرزوئے مرگ — اے داغ اور جو چین نہ آیا فنا کے بعد (داغ)

داغ کے قدردان اس امر پر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں کہ باوجود اسی مطلب کا شعر ہونے کے لوگ داغ کے شعر کی تعریف نہیں کرتے، اس پر کسی کے منہ سے واہ واہ کی صدا نہیں نکلتی۔

غالبؔ کا شعر ہے

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھیرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اس شعر کی کہیں تعریف ہوتی ہے تو مصحفی کے بہی خواہوں کو اس کی شکایت ہوتی ہے کہ مصحفی کا شعر...... جو اسی مضمون کا ہے کیوں کسی قابل نہیں سمجھا جاتا حالانکہ یہی بات اس میں بھی کہی گئی ہے۔

کوچہ ہو ترا یا کوئی مقتل کی زمیں ہو — مرنا ہی ہمیں تو نظر ہے تو کہیں ہو (مصحفیؔ)

میرؔ کا شعر ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

امیر مینائی مرحوم کا شعر ہے

ادب عشق ہی میں رونے لگے تم اے امیر — ابھی تم نے کیے نالے نہ آہیں کھینچیں

یہاں بھی امیر کے معتقدین کو ناقدری کی شکایت ہوتی ہے۔

اسی نوع کی متعدد مثالیں اور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میرا کیا مطلب ہے۔ یگانہ کے اشعار میں اکثر یہ نقص پایا جاتا ہے۔

(۱) وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ — مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

(۲) دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں — انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا

(۳) فردا کا دھیان باندھ کے کہتا ہے مجھ سے دل — تو میری طرح کیوں نہ وسیع النظر ہوا

(۴) اسی [illegible] عناصر کی حقیقت کھل گئی — جب گڑھے میں گور کے انسان داخل ہوگیا

(۵) بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھیے — دنیا کے ہر شاہد ناگوار کو

(۶) وحشت آباد عدم ہے وہ دیارِ خاموش — کہ قدم رکھتے ہی ایک ایک سے بیگانہ ہوجائے

(۷) نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا — اپنی ہر سانس پہ در در کے پشیماں ہونا

(۸) عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے — زمانہ کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

یگانہ

اسی طرح کے اور بہت سے اشعار یگانہ کے کلام میں مل سکتے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نقص ان کی شاعری میں موجود ہے اور وہی ان کی غیر ہر دلعزیزی کا بڑا سبب ہے۔ اصل بات وہی ہوتی ہے لیکن ایک شاعر اسے محض نثر کا نظم بنا دیتا ہے، دوسرا اسی بات کو ذہن میں رکھ کر شعر کہتا ہے جو نہ صرف

بادی النظر میں اس سے بالکل جدا ہے بلکہ درحقیقت ایک اور مسئلہ ہے جس کے ذریعے سے اصل مسئلے کی طرف شاعر نے سلسلہ جنبانی کی ہے۔

فرض کیجیے مسئلہ یہ ہو کہ —— بے ہتھیار جنگ کرنے کی کوشش کرنا مضحکہ خیز ہے۔

اس مضمون کو ایک شاعر اس طرح باندھتا ہے

وہ لڑنے آئے ہیں مجھ سے مگر ستم دیکھو — کہ ہاتھ میں نہ کماں ہے نہ تیر ترکش میں (عارف رامپوری)

دوسرا شاعر اسی مضمون تک یوں پہونچتا ہے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں (غالب)

دونوں شعرا کا فرق مراتب اس مقام پر واضح ہے۔

ایک اور مثال کی غرض سے مسئلہ اسے تصور کر لیجیے کہ "—— تم (معشوق) اور آسمان دونوں میرے (عاشق کے) دشمن ہو ایک کی طرف سے ظلم و ستم نہیں ٹوٹتے ہیں اور اطمینان ہوتا ہے تو دوسرے کی جفا اندازی کا کھٹکا لگا رہتا ہے" —— اسی مضمون کو تھوڑے تفاوت کے ساتھ ایک شاعر یوں نظم کرتا ہے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو (غالب)

اس شعر سے واضح ہے کہ گو اپنی خداداد قوت شاعری کی بنا پر شاعر نے شعر میں بہت کچھ جان پیدا کر دی مگر ایک دوسرے شاعر نے جس طرح اس مسئلہ تک رسائی کی اس دلکشی کو یہ شعر نہیں پہونچا

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں (مومن)

ایک خاص مضمون کو، ایک مخصوص حقیقت کو ایک جدید شاعر یوں بیان کرتا ہے

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا (اصغر گونڈوی)

ایک پرانا شاعر بالکل دوسری چیز بیان کر کے اسی مخصوص نظریہ تک مطلق جداگانہ طریقہ سے رہنمائی کرتا ہے

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو (غالب)

ایک اور قدیم استاد "معشوق کی موجودگی کی حالت" کا نقشہ بطرز ذیل کھینچ کر ایک خاص حالت کی طرف طبیعت کو متوجہ کرتا ہے

اُن کو بلا کے آپ میں ہم خود نہیں رہے — سب کچھ ہماری بزم میں ہے اک ہمیں نہیں (جلال لکھنوی)

ایک جدید شاعر بالکل دوسری وضع سے اسی کیفیت کی طرف ذہن سامع کو منتقل کرتا ہے

تجھ پر نثار ! بزم کے وہ مسکرا دیا — اب سن رہا ہوں شور کہ وہ دل اڑا دیا (عزیز لکھنوی)

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا تمام شعروں میں فرق صرف انداز بیان کا ہے جو ایک نہایت لطیف تفاوت ہے اور جس پر شعر کی خوبی اور دلکشی کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔

بعینہ یہی صورت یگانہ کے ہاں ہے۔ ان کے ہاں بیشتر اشعار اسی نوع کے پائے جن میں ایک خاص کیفیت کی طرف ذہن سامع کی رہنمائی کی گئی ہے لیکن ایک ایسے مضمون سے اور ایسے طرز سے جو چنداں موثر نہیں ہوتا یا کم موثر ہوتا ہے۔ دوسرے شعرا نے ان میں سے اکثر کیفیتوں کو بالکل مختلف طرز سے پیش کیا ہے جن میں سے اکثر یگانہ کے اشعار سے زیادہ دلکش ہیں۔ مثلاً یگانہ کے اشعار ۱ و ۲ و ۳ میں جن خیالات کی طرف طبع سامع منعطف کرائی گئی ہے انھیں کی طرف جداگانہ پیرایوں میں ان اشعار میں بھی طبیعت کو متوجہ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

یگانہ:
وہی ساقی وہی ساغر وہی شیشہ وہی بادہ
مگر لازم نہیں ہر شخص پر یکساں اثر ہونا

تاباں بدایونی:
بقدر ظرف مئے بندگی کا جوش رہا
کسی جبین سے ٹپکی کسی جبیں میں رہی

یگانہ:
اس طلسمات عناصر کی حقیقت کھل گئی
جب گڑھے میں گر کے انسان داخل ہو گیا

تسنیم بنائی:
شو تو کھلتا ہے راز حیات ہستی کا
لحد کے گوشے سے در ہے سکوں کی بستی کا

یگانہ:
وحشت آباد عدم ہے وہ دیار خاموش
کہ قدم رکھتے ہی ایک ایک سے بیگانہ بنے

حیرت رامپوری:
عدم میں آتے ہی حیرت یہ حال ہے اپنا
نہ ہمنفس نہ کوئی ہم خیال ہے اپنا

انھیں مدارج میں شاعر کے وجدان اصلی اور ذوق فطری کا اندازہ ہوتا ہے اور نقاد ہو یا سامع، دونوں کو اس کا خوب احساس ہوتا ہے کہ شاعر کے خمیر میں کہاں تک شعر گوئی کا جزو موجود ہے۔ آیات وجدانی میں یگانہ کے اشعار کا مطالعہ کرکے یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ ان میں یہ جزو اتنی لطافت کے ساتھ نہیں پایا جاتا جس کے ساتھ اور شاعروں میں موجود ہوتا ہے۔ اور اسی حقیقت کی روشنی میں وہ اُردو کے اُن شعرا کی صف میں نہیں رکھے جا سکتے جن میں غالب، میر، اور اقبال جلوہ گر ہیں، انھیں ان وہبی شعرا کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا جو حافظ، سعدی، اور خیام کو دیا جا چکا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یگانہ کے کلام کی دوسری خامی "بیجا اعادہ" اور "تشبیہ و تکرار" ہے، جو نہ صرف انکی "وسعت مطالعہ" "قوت فکر" اور "ہمہ دانی" پر حرف گیر ہے، بلکہ ان کے دعوے جدت پسندی، طبعزادی، اور اختراع پر بھی دھبہ لگاتی ہے۔ مضمون کا مالک شاعر ہوتا ہے، وہ چاہے اُسے دس جگہ نظم کرے یا بیس جگہ، خواہ اسے ایک طرح باندھے یا سو طرح۔ لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ جب تک کوئی جدت، کوئی

نیا انداز بیان، کوئی عجیب پہلو نہ پیش نظر ہو، کسی مضمون کو دہرانا بدمذاقی اور بے بضاعتی کی دلیل ہے۔ یگانہ کے کلام میں اکثر جگہ یہ نقص بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ "بدرجۂ اتم" میں اس بنا پر کہتا ہوں کہ انھوں نے نہ صرف مضمون کو دہرایا ہے، بلکہ قریب قریب وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو بیشتر اسی مضمون کے بیان میں استعمال کر چکے ہیں۔

صفحہ ۶۵۔ "جواب کیا وہی آواز بازگشت آئی — قفس میں نالۂ جاں کاہ کا مزہ نہ ملا" (۱)
" ۱۶۵ — "جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی — دہن سے آہ نکلی نیلائے بےجگر ہو کر" (۲) یگانہ
" ۲۴۹ — پلٹ کے پھر وہی آواز بازگشت آئی — بڑھے نہ حوصلے فریاد بےاجازت کے (۳)

مندرجۂ بالا تینوں اشعار کے مطالب ایک دوسرے سے قدرے مختلف ضرور ہیں مگر "سلسلۂ تخئیل" ایک ہی ہے۔ علاوہ بریں تینوں شعروں میں پہلا مصرعہ تقریباً ایک ہی ہے۔

صفحہ ۱۲۹۔ "سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا — شمع گل ہو گئی دل بجھ گیا پروانے کا" (۱) یگانہ
" ۱۳۲ — "بزم میں صبح ہوئی چھا گیا اک سناٹا — سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا" (۲)

مطالب اور الفاظ گویا کہ ایک ہی ہیں، ایک شعر کی موجودگی میں دوسرے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی طرح اکثر مقامات پر یگانہ نے بالکل خفیف سے فرق کے ساتھ مصرعے دہرائے ہیں نمونہ کے لیے ایک پیش کیا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۴۸ — محوِ طلسم بندیِ اسرار دیکھ کر
صفحہ ۱۵۵ — محوِ طلسم بندیِ نقش و نگار دیکھ کر

مجھے معلوم ہوا ہے کہ شعرائے ماضی میں سے بعض نے اور نیز غالب نے اپنے کلام میں مصرعوں کا اعادہ کیا ہے، مگر صرف کسی خاص ضرورت کی بنا پر۔ مثلاً غالب کا مطلع ہے

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اسی غزل کا مقطع ہے

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دونوں شعروں کے دوسرے مصرعے یکساں ہیں لیکن ظاہر ہے کہ دونوں کے مطالب میں کس قدر بین فرق ہے۔ ایسے مقامات پر بھی اعادہ اور تکرار گو کچھ مستحسن نہیں مگر بہرحال کچھ زیادہ قابل گرفت بھی نہیں۔ لیکن یگانہ کے کلام میں جس صورت سے اعادہ اور تکرار کا وجود پایا جاتا ہے وہ ضرور لائق اعتراض ہے خصوصاً اس حالت میں، کہ یگانہ بہ زبان خود نہایت زور شور سے سرتاج شعرا، وسرآمد سخنداں ہونے کے مدعی ہیں

یہ تو تھی میری رائے یگانہ کی شاعری کے متعلق مجموعی حیثیت سے، اب میں ان کے چند اشعار سے فرداً فرداً بحث کرتا ہوں۔

صفحہ ۶۵ ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزل مقصود — دلیل راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا (یگانہ)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں جو اصولی سقم ہے وہ ظاہر ہے، دوسرے مصرعہ میں محاورہ یوں باندھا گیا ہے۔ ملا ملا نہ ملا۔ حالانکہ ہونا چاہیے تھا ملا ملا نہ ملا نہ ملا — علاوہ بریں اس شعر میں [ہزار ہاتھ بمعنی اغلباً] اور [دلیل راہ بمعنی رہنما] دونوں کے استعمال نے ایک درجہ فصاحت سے گرا دیا ہے، کیونکہ یہ دونوں ٹکڑے بہت نامانوس ہیں۔

صفحہ ۸۹ پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن — میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا (یگانہ)

اس شعر کا مطلب کسی صورت سے واضح نہیں ہوتا اور نہ دونوں مصرعوں کا رابطہ سمجھ میں آتا ہے۔

صفحہ ۹۱ چراغ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا — لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا (یگانہ)

قاعدہ ہے کہ جب آگ بجھتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے [اس لیے دھواں نکلا کے بجائے دھواں اٹھا ہونا چاہیے] آگ کے لگنے کے بعد دھواں شعلوں کے بھڑکنے کی وجہ سے نہیں نکلتا۔ اسی طرح چراغ بجھنے پر دھواں اٹھتا ہے، اس لحاظ سے پہلا مصرعہ تو درست ہے لیکن دوسرے مصرعہ کا اس سے ثبوت حاصل کرنے میں یہ تضاد پیدا ہوتا ہے کہ آگ لگنے کے بعد دھواں کیا۔

صفحہ ۹۵ خوشی سے ہو گئے بدخواہ میرے شادی مرگ — کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا (یگانہ)

جذبۂ حسد کی یہ تصویر کس قدر مبالغہ آمیز اور اصل سے کس قدر دور ہے، علاوہ بریں دوسرے مصرعہ میں قافیہ "ناگہاں" بالکل فضول ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں گھر سے کفن پہن کے نکلا تو میرے بدخواہ شادی مرگ ہو گئے"۔ "ناگہاں" کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی اور نہ یہ لفظ اس شعر میں کوئی معنی دیتا ہے۔

صفحہ ۱۳۴۔ تم سراسر رنج دینے پر جب آمادہ ہوئے — میں سراپا درد سہنے کے لیے دل ہو گیا (یگانہ)

دوسرے مصرعہ کا مطلب اگر یہ ہے کہ عاشق درد سہنے کے لیے سراپا دل ہو گیا، تو سراپا کا دل سے اس قدر دور لانا کتنی بڑی تعقیدی غلطی ہے اور اگر سراپا کو درد سے نسبت ہے تو کوئی مطلب نہیں نکلتا۔

صفحہ ۱۳۴ ہم بھی اب تنگ آ گئے اس کہنگی پوشاک سے — جامۂ تن دھجیاں لینے کے قابل ہو گیا (یگانہ)

ہم دھجیاں لینے کا مفہوم بکھیرنے سے قائم ہوا، اگر کوئی محاورہ ہے تو ہم نے آج تک کسی استاد کے یہاں نظر سے نہ دیکھا۔

صفحہ ۱۳۵۔ کیوں یاس یوں ہی دُور سے مُنہ تکتے رہو گے — بے مانگے تو اس بزم میں ساغر نہیں ملتا (یگانہ)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں "کیوں" کے بجائے "کیا" ہو تو شعر کا مطلب زیادہ صحیح نکلے گا۔

صفحہ ۱۴۱۔ اپنا ہاتھ اپنا گریباں اپنا سودا اپنا سر — استعارہ کر چکے پابند فرمان بہار (یگانہ)

پہلے مصرعہ میں سودا کے ساتھ اپنا کا لفظ بے معنی ہے، نیز اپنا کا الف کئی جگہ دبتا ہے۔

صفحہ ۱۴۱۔ پیرہن کیا گھر بھی خوشبو کے لیے تارِ تنگ ہے — آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زندان بہار (یگانہ)

دوسرے مصرعہ میں ردیف ——— بہار ——— محض ٹھونس ٹھانس ہے۔ بہار کا لفظ علیحدہ آنا چاہیے تاکہ شعر کا مطلب صاف ہو۔

صفحہ ۱۵۲۔ دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو کس طرف کو ہے — جوشِ جہاد کافر و دیں دار دیکھ کر (یگانہ)

فصحا کبھی یوں نہیں بولتے کہ "تو کس طرف کو ہے"۔

صفحہ ۱۵۹۔ بتاؤ ایسے بندے پر ہنسی آئے کہ غیظ آئے — دعا مانگے مصیبت میں جو قصداً مبتلا ہو کر (یگانہ)

دوسرے مصرعہ میں تعقید کا عیب نمایاں ہے۔ جو کا لفظ مصیبت کے لفظ سے پیشتر آنا چاہیے۔

صفحہ ۱۷۸۔ جہنم ہو کہ جنت طائرِ جاں تھم نہیں سکتا — کہیں پرواز کی حد مل سکے گی لامکاں ہو کر (یگانہ)

دوسرے مصرعہ میں لامکاں کے کچھ معنی نہیں نکلتے۔ روح یا طائرِ جاں مقیم لامکاں تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا لامکاں ہو جانا نہ صرف بعید از قیاس ہے بلکہ دلیل جہالت بھی۔

صفحہ ۱۷۹۔ ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا — یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر (یگانہ)

نہیں معلوم یگانہ کی نظر میں کون سا جلنا جلنا کہلا سکتا ہے، اہل ذوق اور اصحابِ نظر کے خیال میں تو وہی جلنا کام کا ہے جس میں سلگنا پڑے اور دھواں نکلتا رہے۔ رہا پروانہ کا سا جلنا کہ شعلہ پر پیچ و تاب ہو کر چند لمحوں میں خاک ہو جاتا ہے تو وہ معیارِ عشق کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۷۹۔ پھڑکتے ہیں مگر بیدرد منہ سے کچھ نہیں کہتے — یگانہ یاس نے مارا ہے دردِ بے زباں ہو کر (یگانہ)

دردِ بے زباں کی ترکیب بالکل بے معنی اور شاعر کے سہو و ذہنی کے بالکل برعکس ہے۔

صفحہ ۱۸۳۔ ہوئے کیوں بارِ خاطر خود بخود گھبرا کے مر جاؤ — ڈھلے پڑتے ہیں آپی آپ کیوں گھبیں کے اس پہ (یگانہ)

آپی شعرائے متقدمین اسی طرح استعمال کرتے تھے جس طرح کسو، کبھو، تلک ——— شعرائے مابعد نے زبان کی اصلاح کے دور میں ان الفاظ کو متروک قرار دے کر ان کے استعمال کو غیر فصیح قرار دیا۔ اگرچہ میر انیس نے اپنے چند مرثیوں میں ضرورتِ شعری کی وجہ سے ایک آدھ جگہ استعمال کیا ہے مگر مجموعی حیثیت سے اس کا استعمال فصاحت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ریاض خیرآبادی کا شعر تھا

ہنگام نزع گریہ بیاں بیکسی کا تھا   آپ ہی بتائیں کون یہ موقع ہنسی کا تھا   (ریاض)

امیر مینائی مرحوم نے آپ ہی پر بجنسہ یہی اعتراض کرکے دوسرے مصرعہ کی اصلاح یوں کی

تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

صفحہ ۱۹۱۔ دُہائی کھینچے والا قفس سے تاک رکھنا کیا   مبادا آگ برسے آنچ آ جائے نشیمن پر   (یگانہ)

دہائی کھینچنے والوں کی صحت میں مجھے کلام ہے۔

صفحہ ۱۹۳   یاد گاہ کب تلک شام وسحر نازیں   (یگانہ)

تلک اب غیر فصیح سمجھا جاتا ہے اس لیے "بہ زعم خود شاعر بے بدل یگانہ" کو اس کے استعمال سے باز رہنا چاہیے تھا۔

صفحہ ۲۰۳ پر مجذوب کی بڑ کے عنوان سے ایک نظم نما غزل ہے، جسکے شروع کے دو اشعار یہ ہیں

ہارنے والے کبھی کا نزد وینہ ار نہیں   کشتیاں کرتے ہیں اب ہاتھ میں تلوار نہیں
فائدہ کیا ہیں یہ موقع ہے الہیٰ توبہ   نشہ ایسا کہ اترنے کے کچھ آثار نہیں   (یگانہ)

اور آخری شعر ہے

بک گیا ہوں خودی میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخری شعر اور بقیہ دوسرے اشعار کی بحروں کا فرق یگانہ جیسے "استاد" کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا۔ کیا "مجذوب کی بڑ" کا عنوان رکھ کر وہ تمام عروضی، شعری، اور تخیلی خامیوں سے بری الذمہ ہو گئے۔ اگر ایسا ہو تو ہر شخص اپنی نظموں کی یہی سرخی رکھ کر بری ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۲۰۴۔ دست شل کو دخل ناممکن خط تقدیر میں   جائے نقطہ بھی نہیں باقی کسی تحریر میں   (یگانہ)

دست شل کی معنویت کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر اس ٹکڑے کی شعر میں کیا حاجت ہے، محض لفظ "دست" کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن شل کی کیا ضرورت ہے۔

صفحہ ۲۰۶۔ شوخیاں کیا کیا دکھائیں حسن مشت خاک نے   عالم جاں سے نکل کر عالم تقریر میں   (یگانہ)

مطلع کے سوا مصرعہ کے آخر میں ردیف کا استعمال ہمیشہ اساتذہ کے نزدیک غیر مستحسن رہا ہے، گو بعض کم علم شعرا نے اس قسم کا عمل جائز رکھا لیکن یگانہ کو جس علم و فن کا دعویٰ ہے اسے دیکھتے ہوئے تو یہ استعمال احسن نہیں۔

صفحہ ۲۱۰   کعبہ نیا بناؤ مرے دل کو توڑ کر   اے مہربان آپ کے قابل یہ گھر نہیں   (یگانہ)

پہلے مصرعہ میں بناؤ سے اس کا ثبوت کہ مخاطب "تم" سے کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں تخاطب آپ

ہے۔ شعر گربہ کی اتنی ادنیٰ مثال ہے کہ مبتدی سے مبتدی شاعر کے یہاں بھی نہ پائی جائے گی چہ جائیکہ یگانہ
جیسے "خوش فکر اور کہنہ مشق" شاعر بے بدل کے کلام میں۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

صفحہ ۲۲۶ - دلِ بیدار گھبرائے نہ کیوں اس اندھی نگری میں — نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اک دیارِ بے شبستاں کو (یگانہ)

'دیارِ بے شبستاں' سے مراد ایسی جگہ لینا جہاں رات کا نام ہی نہ ہو، دن ہی دن ہو، اصلیت سے کوسوں دور ہے۔ الفاظ ان معانی کے متحمل نہیں۔

صفحہ ۲۲۹ . چلے چلو دلِ دیوانہ کے اشارے پر — محال و ممکن سب اسکے اختیار میں ہے (یگانہ)

اس شعر میں دوسرے مصرعہ کی موزونیت پہ ہزار موزونیتیں قربان ہیں

صفحہ ۲۳۰ . کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے — رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے (یگانہ)

دوسرے مصرعہ سے کاتبِ تقدیر کے عیب کا ثبوت تو ملتا ہے ہنر کا نہیں ملتا۔

صفحہ ۲۳۱ - وہ کشمکشِ غم ہے کہ میں کہہ نہیں سکتا — آغاز کا افسوس اور انجام کا ڈر بھی (یگانہ)

دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا

آغاز کا افسوس بھی انجام کا ڈر بھی

اب اس مصرعہ میں روانی اور معنویت زیادہ ہے۔

صفحہ ۲۴۳ . تنگ محفل مرا زندہ مرا مُردہ بھاری — کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

(ا) (ب) — (ا) (ب)

مصرعہ اولیٰ میں پہلے زندہ کا ذکر ہے جسکا تعلق 'بٹھاتا ہے مجھے' سے ہے، بعد ازاں مردہ کا ذکر ہے جس کو 'اٹھاتا ہے مجھے' سے نسبت ہے۔ ارباب فہم کے نزدیک دوسرے مصرعہ کی ترتیب بھی پہلے مصرعہ کی ترتیب کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ یہی قاعدہ دونوں مصرعوں کو منطبق کرنے کے لیے اور نقطۂ نظر سے بھی صحیح ہے۔ لیکن یہاں بالکل اس کا عکس ہے۔

یہ میں نے چند اُن خامیوں پر روشنی ڈالی جو بالکل سامنے کی تھیں، انکے علاوہ اور بھی بہت سی کمزوریاں ہیں جن میں سے چند اسی نوع کی ہیں جو میں پیش کر چکا ہوں اس لیے انکا ذکر کرنا محض اعادہ ہوگا لیکن بعض میں اس لیے نظر انداز کر رہا ہوں کہ ان میں فنی پیچیدگیاں ہیں جو نہ صرف غیر دلچسپ ہونگی بلکہ لوگ انہیں بسہولت سمجھ بھی نہیں سکتے۔

قبل اس کے کہ میں اس موضوع سے بحث ختم کروں ایک امر اور واضح کر دینا چاہتا ہوں میرزا

مراد نے آیات وجدانی میں یگانہ کے ہر شعر کو ماسٹر پیس (Masterpiece) لکھا ہے۔ ہر دوسری غزل یگانہ کی ان کے نزدیک بیسویں صدی کا ماسٹر پیس ہے، ہر دوسرا شعر ان کی نظر میں اُردو ادب کا ماسٹر پیس ہے۔ ماسٹر پیس (Masterpiece) انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ اُردو میں شاہ کار کیا گیا ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں "Chief excellence" یعنی شاہ کار لیکن اصطلاح میں یہ ایک اور مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے "piece of work worthy of a master" یعنی نایاب اور بے مثل کار ــــ اول الذکر معنی کے لحاظ سے ہر شخص کا صرف ایک شاہ کار ہو سکتا ہے دو چار اور دس بیس شاہ کار ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ ایسا کہنا لغو اور مہمل ہے۔ دوسرے مفہوم کی رو سے اس کا اطلاق ایک سے زیادہ پر تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن کسی شخص کے ہر فعل کو اُس کا ماسٹر پیس کہنا اس صورت میں بھی بالکل لا یعنی سا ہوگا ــــ ان دو معانی کے علاوہ کسی تیسرے مفہوم کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے یہ لفظ نہ سنا گیا نہ دیکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مراد کا یگانہ کے ہر حصۂ کلام کو اُن کا شاہ کار کہنا، نایاب اور بے مثل ظاہر کرنا کس قدر غلط اور کس درجہ جہلیت پر مبنی ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں یگانہ کے تمام اشعار اچھے نہیں۔ لیکن ان کے یہاں اچھے شعر بھی پائے جاتے ہیں، ان عمدہ شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ذہانت اور ذکاوت کا جزو موجود ہے لیکن وہ جزو ہر لمحہ عمل پذیر نہیں رہتا صرف خاص خاص موقعوں پر یگانہ اس سے مستفید ہوتے ہیں اور اس استفادہ کی حالت میں جب کوئی شعر وہ کہتے ہیں تو وہ ادب کے لیے مایۂ ناز ہوتا ہے نہ کہ ان کا ہر شعر۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے کلام میں اچھے اشعار بھی ہیں ان کا نام اُن شعرا کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا جن کی ذہانت اور ذکاوت کسی وقت بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی۔ اس قسم کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ مذہبی اور وجدانی ہے۔ غالب انھیں شعرا میں داخل ہے۔ اور اسی جا یگانہ اور غالب کے مراتب کا نازک فرق پوشیدہ ہے۔

موجودہ شعرا میں البتہ یگانہ کا نام ایک اچھی اور معزز جگہ پانے کا مستحق ہے کیونکہ ان کے اشعار سے وہ معنویت مفقود نہیں جو آج کل کے بیشتر شعرا کے یہاں عام ہے۔ گو دو ایک جگہ یگانہ کے اشعار میں بھی مطلب صرف اُنھیں کے ذہن میں رہ گیا ہے شعر کے الفاظ اُس کے حامل نہیں ہوئے ہیں لیکن اُن کے یہاں اس نقص کی اتنی کثرت نہیں ہے جتنی چند اور شعرا کے کلام میں ہے۔ علاوہ بریں ان کو زبان پر بھی خاصی دسترس حاصل ہے اس وجہ سے ان کے کلام میں "ادب لطیف" کا جزو بہت کم ہے جو ان کے کلام کو نہ صرف زبان زد خواص اور مقبول عام بنانے کے لیے سند ہے بلکہ اس کو معانی کا

جامہ پہنانے میں بھی مطلق نظری (abstract) اور بعید از قیاس (absurd) مسئلوں سے کشاکش کرنا نہیں پڑتی۔ یگانہ کی قوت اختراع بھی اچھی ہے۔ انھوں نے اکثر ترکیبیں بالکل جدید اور جامع بنائی ہیں مثلاً جلوۂ بیرنگ، منزل فانوس، ذوق آشیاں، دل شب چراغ —— اس لحاظ سے ان کے کلام میں جگہ جگہ جدت طرازی کا حسن بھی پایا جاتا ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی یگانہ ایک خوش فکر، جدت پسند، اور صاحب علم شاعر ہیں۔ اگر ان کو وہ غلط فہمیاں نہ رہیں جو اب تک ہیں تو انھیں ہند کے سربرآوردہ اُردو شعرا میں گنا جا سکتا ہے۔

(۹)

خدا کا شکر ہے آیاتِ وجدانی پر تنقید ختم ہو گئی۔ میرے قلب کو ایک نامحدود خوشی ایک بے پایاں مسرت ہے کہ میں نے غلط بیانیوں کے اس جال کے تار و پود بکھیر دیے، فریب کے اس گھروندے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، جہل کے اس طلسم کو توڑ دیا۔ گو اس طلسم کشائی میں مجھے امیر حمزہ فاتح طلسم ہوشربا سے زیادہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا، نہ عمرو کا سا شریک مشورہ تھا، نہ کوکب روشن ضمیر سا نصرت کا پتلا جن سے اخلاقی جرأت بھی ملتی اور طبیعی امداد بھی۔ ہر حال (all is well that ends well)
(جسکا انجام سکون ہو وہ اضطراب اچھا ہے)

منت از بازوے خود آرم بے شکر

اس طلسم کا افراسیاب خانہ خراب جسے طلسم ہوشربا کے افراسیاب سے زیادہ غرور و تمرد تھا، جسے "باغِ سیب" کے افراسیاب سے زیادہ سحر و جادو یاد تھے۔ جس افراسیاب کو "صنعتِ سحر ساز" سے "مکار تر" "اہبانِ زمرد پوش" سے "فریبی تر" "آفات چہار دست" سے "مغرور تر" مددگار حاصل تھے، جس افراسیاب کی بزم کو "تاریک شکل کش" سی خونخوار ساحرہ رونق دیتی، "حجرۂ ہفت بلا" سے "ہیبت ناک تر" آفتیں تیار تھیں، اس افراسیاب کا قلع قمع کرنا، اس افراسیاب کے اسپیں "تلوار مارنا کہ" کلّہ سر کو کاٹتی ہوئی تا جگرگاہ اُتر آئے" آسان کام نہ تھا۔ ہر سحر کا رد دریافت کرنا، ہر منتر کا اُتار معلوم کرنا، ہر کاٹ کی دارو مہیا کرنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ لیکن میں نے ان تمام دشواریوں کو، ان مشکلات کو شیر مادر سمجھ کر برداشت کیا، ان تمام پُرخار گھاٹیوں، دشوار گزار وادیوں کو مردانہ وار طے کیا۔ میرے تمام مصائب میں غالب کی روح اور اسکا کلام میرے لیے شمع ہدایت رہے۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر اس کی روح ہمت افزا انداز سے مسکراتی تھی، جب مجھے دشواریوں میں گھبرایا پاکر اس کا کلام اپنی تمام خوبیوں کو میرے سامنے کھول دیتا تھا۔ غالب کی روح کے ہمراہ اور شعرائے مشرق کی روحیں بھی ہنستی ہوئی نظر آتی تھیں اور ان پاکباز بزرگوں، پاک نفس

درویشوں کے کلام سے مجھے جتنی مدد ملی ان پاک طینت حضرات کی دستگیری سے میری جتنی معاونت ہوئی اسی کا طفیل تھا کہ میں نے اتنے عظیم مراحل کو طے کر لیا، اتنے وسیع مراحل کو عبور کر لیا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا بہت امکان ہے کہ میری یہ تنقیدی کوشش اکثر اصحاب کو ناگوار ہو، اُن کے لیے میرے جوابات "خنجر و نشتر" ثابت ہوں، میرے الزامات "تیر و تفنگ" کا کام دیں۔ میرا حرف حرف اُن کے قلوب پر جراحت پذیر ہو لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں تسلیم کرتا ہوں کہ دوران تنقید میں اکثر موقعوں پر میرے ہاتھ سے دامن صبر و ضبط چھوٹ گیا ہے، اور میں اتنے تلخ جملے لکھ گیا ہوں جو نظری حیثیت سے کسی طرح مستحسن نہیں، میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ضمن مضمون میں کئی جگہ میری برداشت کی طاقت یارا نہیں کر سکی ہے اور میرے قلم سے اس قدر تیز و تند عبارت نکل گئی ہے جو متانت کے مدنظر کسی آئینہ مناسب نہیں۔ میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ میری یہ تنقیدی کوشش، تنقید کی کسوٹی پر پوری اُترے گی، میں یہ دعوے نہیں کرتا ہوں کہ میرا یہ مضمون مضمون نویسی کے اصولوں کے مطابق ہوگا۔ میں نہایت صفائی سے اس کا اقرار کرتا ہوں کہ کتاب کو دیکھ کر مجھ میں جو جذبات نفرت اور حمیت پیدا ہوئے اُن کے سبب سے میں یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکا کہ تنقید میں محض علمی مسائل سے مطلب رکھوں، میں نہایت آزادی سے ناظرین کو باور کراتا ہوں کہ جملہ شعرائے ماقبل اور خصوصاً غالب کی تنقیص و تذلیل ہوتے دیکھ کر میرے دل میں غصہ اور غیض کی جو لہر اُٹھی اس نے میرے دائرۂ خیال کو نسبتاً محدود کر دیا۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے واسطے میں قابل الزام نہیں، ان تمام خامیوں کے واسطے میں مورد ملامت نہیں بلکہ یگانہ اور مراد ہیں

کلوخ انداز را پاداش سنگ است

اس تنقید کے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ میں نے دوران تنقید میں کہیں ہٹ دھرمی، سفلہ پن اور ابتذال سے کام نہیں لیا ہے۔ میں نے جہاں یگانہ اور مراد کے رکیک حملوں سے مجبور ہو کر ایک کی قوت نثر نویسی اور دوسرے کے دعوے شعر گوئی کی خبر لی ہے وہاں کم سے کم یگانہ کے حقیقی کمالات کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر ایک جگہ مجھے یگانہ کی بدزبانیوں کا جواب دینا پڑا ہے تو دوسری جگہ میں نے اُس کی خوش کلامی کی داد بھی دی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کی جہالت اور سفلہ پن، یگانہ کی غیظی اور ابتذال [illegible]